افکار

حمید احمد خان ایڈیشن

زراعتی انقلاب کی زرخیز راہوں پر
جگہ جگہ یو بی ایل کی شاخوں کا سِلسلہ
محنت کش کسانوں کی خدمت کیلئے مستعد و منتظِر

زمین زرخیز ہے اور کسان محنت کش ۔ زراعتی انقلاب پیداوار کی افزائش
اور بہتری اور کسانوں کی خوشحالی کے لئے نئی راہیں کھول رہا ہے.
یو بی ایل ان راہوں پر چلنے کے وسائل فراہم کرنے اور مسائل حل کرنے میں
آپ کا معاون و مددگار ہے ۔
یہ وسائل کیا ہیں ــ ؟ عُمدہ بیج کی بر وقت فراہمی، مناسب کھاد، حسب ضرورت
ٹریکٹر، ٹیوب ویل وغیرہ، صحت مند مویشی اور زراعت کے متعلق بہتر معلومات.
عمدہ فصلوں کے خوب پھُولنے پھلنے سے سب کے لئے خوشحالی آئے گی.

راہِ ترقی میں پیش پیش

یو بی ایل

انٹرنیشنل بینک
یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

VBL.R.6.193.73.UD.

R: LINTAS

دُنیا بھر میں اہلِ ذوق
کیپسٹن
طلب کرتے ہیں
CAPSTAN
FILTER
CAPSTAN
۵۰ر۲ رُوپے میں ۲۰
۲۵ر ا رُوپے میں ۱۰
بمع سرچارج
اور فلڈ ریلیف
سرچارج
PTC 73-CA 3

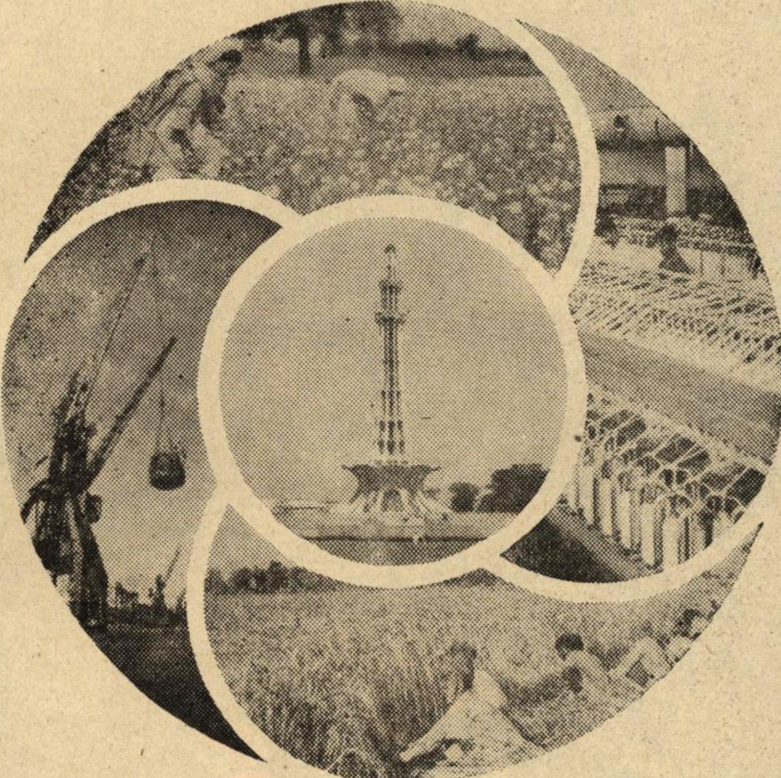

نیا اِک نظامِ معیشت
بنانے میں شامِل

نیشنل بینک آف پاکستان

IAL - NBP -13 - 73

گلیکسوز۔ ڈی

ٹریڈ مارک

آپ کی توانائی کی تعمیر کرتا ہے

گلیکسوز۔ ڈی توانائی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ بیماری میں یا بیماری کے بعد یا دن بھر کام کاج سے کھوئی ہوئی توانائی گلیکسوز۔ ڈی کے استعمال سے دوبارہ حاصل کیجئے۔ گلیکسوز۔ ڈی میں شامل گلوکوز فوری توانائی بخشتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں شامل کیلشیم اور فاسفورس غذائیت بہم پہنچاتے ہیں اور اعصاب کو قابو میں رکھنے میں مدد دیتے ہیں اور وٹامن ڈی کیلشیم کو ہضم کراتا ہے۔ ایک بڑا چمچہ بھر گلیکسوز۔ ڈی چائے، کافی، پھلوں کے رس یا سادے پانی میں گھول کر دن میں دو یا تین بار استعمال کرنا موجودہ دور کی ہنگامہ خیز زندگی سے مقابلہ کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

گلیکسوز۔ ڈی فوری توانائی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ

* گلیکسوز۔ ڈی میں تین خاص اجزا شامل ہیں۔

* ۱۔ اعلیٰ درجہ کا گلوکوز: غذائیت اور توانائی فوری بہم پہنچاتا ہے	* ۲۔ کیلشیم اور فاسفورس: غذائیت بہم پہنچاتے ہیں اور اعصاب کو قابو میں رکھنے میں مدد دیتے ہیں	* ۳۔ وٹامن ڈی: کیلشیم کو ہضم کراتا ہے۔

گلیکسوز۔ ڈی کا نام لیکر خریدیئے
۵۰ گرام کے عوامی ڈبے کے علاوہ ۴۔ اونس اور ۱۶، اونس کے ڈبوں میں بھی دستیاب ہے۔
گلیکسو لیباریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ

XO.2.74.UD.183. R:LINTAS

عالیہ کی راہ میں
یورپ کے آٹھ حسین شہر

پیرس، روم، ایتھنز، میڈرڈ، استنبول، فرینکفرٹ
لندن، کوپن ہیگن
براستہ عمّان

شاہانہ مہمان نوازی کے لئے عالیہ ایرلائنز سے پرواز کیجئے۔ ہماری خوبصورت فضائی میزبانوں کی مستعد خدمت ہمارے تجربہ کار پائلٹوں کی مہارت اور ہمارے بوئنگ ۷۰۷ کا آرام دہ ماحول آپ کے یورپ کے سفر کو صحیح معنوں میں شاندار بنا دیتے ہیں۔ عالیہ آپ کے لئے چشم براہ ہے۔

روم، لندن، میڈرڈ، استنبول، فرینکفرٹ، کوپن ہیگن کے لئے ہفتہ میں دو بار۔ پیرس کیلئے ہفتہ میں تین بار۔ اور ایتھنز کے لئے ہفتہ میں ایک بار۔

مزید معلومات کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا ہمارے مندرجہ ذیل دفتروں سے رابطہ قائم کیجئے۔
پیلس سینما بلڈنگ، کراچی۔ فون نمبر ۷-۵۱۲۰۲۶
ایمبیڈر ہوٹل۔ لاہور۔ فون نمبر ۵۶۸۵۲
العباس مارکیٹ۔ آدم جی روڈ، صدر، راولپنڈی۔ فون نمبر ۶۳۲۴۲

عالیہ

دی رائل جارڈینیئن ایرلائنز

IAL-ALIA-3-74

محکمہ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، راولپنڈی
اور جنرل ہیڈکوارٹرز آرمی ایجوکیشن سے منظور شدہ

جاری شدہ: —— ۱۹۴۵

ٹیلیفون نمبر: —— ۷۳۹۹۳

حمید احمد خاں ایڈیشن

افکار

مدیر

صہبا لکھنوی

زرِ سالانہ

بیرونی ملکوں سے	رجسٹری سے	معمولی ڈاک سے	فی پرچہ
۳ پونڈ۔ ۱۲ ڈالر	۲۸ روپے	۲۲ روپے	پانچ روپے

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ۔ کراچی

بریڈ فورڈ آفس
۲۴۔ پارک ہل ڈرائیو۔ بریڈ فورڈ ۸ (یارکس۔ یو۔کے)

فرد قایم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
(اقبال)

محمد فاروق ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

فرسٹ فلور فنلے ہاؤس
آئی۔ آئی چندریگر روڈ
کراچی

تار کا پتہ
"فاروق ٹیکس"

ٹیلی فون :— ۲۲۴۰۵۸ — ۲۳۱۵۲۳

ترتیب

صہبا لکھنوی	۱۳	حمید احمد خاں کی یاد میں
ادارہ	۱۵	حمید احمد خاں — ایک جائزہ

غیر مطبوعہ اور یادگار خطوط

پروفیسر حمید احمد خاں	۱۷	اپنے بیٹے سعید احمد خاں کے نام
"	۱۸	سید وقار عظیم کے نام
"	۱۸	احمد علی خاں اور ہاجرہ مسرور کے نام
"	۲۳	شان الحق حقی کے نام
"	۲۴	محسن بھوپالی کے نام

دو یادگار تحریریں — ایک انٹرویو

پروفیسر حمید احمد خاں	۲۵	رسالتمآب کے عہد میں حقوق انسانی
ڈاکٹر سید معین الرحمن	۳۰	بابائے اردو اور پروفیسر حمید احمد خاں
پروفیسر حمید احمد خاں	۴۱	اردو ادب (۴۵ — ۱۹۷۰ء)

شعراء کے نذرانے

فاضل زیدی — طاہر شادانی	۴۴	تاریخ ہائے وفات
عبد العزیز خالد	۴۵	رونق لاہور
عظیم قریشی	۴۷	عبقری کی موت
غلام رسول ازہر	۴۸	بیاد حمید احمد خاں
طاہر شادانی	۵۰	آہ! پروفیسر حمید احمد خاں
سیف نیاز	۵۲	پروفیسر حمید احمد خاں

فکر و فن کے آئینے میں

ڈاکٹر سید عبد اللہ	۵۲	حمید احمد خاں — ذوق و شوق کا پیکر
سید وقار عظیم	۵۶	ارمغان حالی
ڈاکٹر فرمان فتحپوری	۶۳	پروفیسر حمید احمد خاں اور مرزا غالب
محمد علی صدیقی	۶۹	اقتدار کا سفیر

یادیں اور آنسو
تاثرات، تعزیتی خطوط، قراردادیں

حامد علی خاں	۷۳	حمید احمد خاں کی لفظی تصویر
بیگم اکبر علی تنویر	۷۶	میرا پیارا بھائی
جسٹس ایس اے رحمٰن	۷۹	ایک اور شمع خاموش ہوگئی
جسٹس انوارالحق	۸۱	ایک باکردار شخصیت
پروفیسر قاضی محمد اسلم	۸۵	پروفیسر حمید احمد خاں
احمد ندیم قاسمی	۸۹	تہذیبی قدروں کی زندہ علامت
میرزا ادیب	۹۲	میرے محترم استاد
جمیل الدین عالی	۹۵	پروفیسر حمید احمد خاں کی یادیں
انتظار حسین	۹۹	غالب، گھڑی، اقبال اور پاکستان
پروفیسر اقبال مرزا	۱۰۱	حمید احمد خاں کی شخصیت
ابن انشاء	۱۰۷	یادِ یارِ مہرباں
مرزا ظفر الحسن	۱۰۹	ہم ذوق، ہمدرد، ہم داستان
ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	۱۱۵	حمید احمد خاں
وارث میر	۱۱۷	پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم
مقبول جہانگیر	۱۲۱	مشرق و مغرب کی خوبیوں کا حسین امتزاج
اسرار زیدی	۱۲۵	اک چراغ اور بجھا
زاہد ڈارانی	۱۲۸	اک آزاد مرد
یونس جاوید	۱۳۲	دوسرا دن

تعزیتی خطوط

۱۳۸ تا ۱۵۹

آنسہ طلعت - ڈاکٹر ممتاز حسن - ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی - شان الحق حقی - آفتاب حسن
ڈاکٹر جمیل جالبی - مشفق خواجہ - خواجہ حمید الدین شاہد - ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی
ڈاکٹر شمس الدین صدیقی - علاءالدین خالد - حق نواز قیصرانی - محمد مطیع اللہ -
ڈاکٹر سید ارشاد نوحی - محمد عنایت اللہ شیخ - بشیر محمود اختر - نواب مشتاق احمد خاں
سید قاسم محمود - بشیر احمد ساجد - سعید اختر درانی - حافظ محمد انور خاں - سعید احمد خاں

مختلف ادارے ۱۵۹ تعزیتی قراردادیں

چھپتے ــــ چھپتے

ڈاکٹر ممتاز حسن	۱۶۳	اردو زبان کا عاشق
توصیف احمد	۱۶۴	حمید احمد خاں ہمیں کب اچھے لگے
حمید احمد خاں	۱۶۶	دو خط ــــ صہبا لکھنوی کے نام

اشاریہ

حمید احمد خاں کی یادیں

اردو ادب کی اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوگی کہ پروفیسر حمید احمد خاں ایسی باکمال، بلندپایہ اور مایۂ ناز شخصیت بھی ہم سے جدا ہوگئی۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ علم و فن، تحقیق و تجسس اور تہذیب و شایستگی کا ایک مثالی نمونہ۔ عمر بھر علم و ادب کی خاموشی سے خدمت کرتے رہے اور کبھی کسی عنوان اپنے کارناموں پر اچٹتی سی نظر بھی نہیں ڈالی۔ بڑے آدمیوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ حمید احمد خاں غالب و حالی کے عاشق اور اقبال کے سچے پرستار تھے۔ انھوں نے جتنا کچھ سرمایہ چھوڑا ہے، وہ انھیں زندۂ جاوید رکھنے کے لیے کافی ہے۔

افکار۔ اور راقم الحروف سے انھیں دلی وابستگی تھی۔ شاید افکار پہلا خوش نصیب رسالہ ہے جس میں اُن کی نگارشات وقفہ وقفہ سے شایع ہوتی رہیں۔ بقول خود وہ کوتاہ قلم ضرور تھے لیکن جتنا کچھ انھوں نے اردو ادب کو دیا ہے اُس کا شمار یقیناً ادب عالیہ میں ہوگا۔ اُن کے خطوط کا انداز دوسروں سے قطعی مختلف تھا۔ ان ذاتی خطوط میں بھی اُن کا منفرد اسلوب صاف جھلکتا ہے۔ افکار نے بصد عقیدت و احترام مختصر سے وقت میں اُن کی یاد تازہ رکھنے کے لیے یہ شمارہ ترتیب دیا ہے لیکن خود ہمیں احساس ہے کہ ہم حمید احمد خاں صاحب کی مثالی زندگی اور ان کے وقیع کارناموں کا مکمل احاطہ نہیں کرسکے۔ ہمیں یقین ہے کہ مجلسِ ترقی ادب کے اربابِ اختیار پروفیسر حمید احمد خاں کی زندگی، شخصیت اور فن پر ایک جامع کتاب ضرور شایع کریں گے۔ اس طرح نئی نسل کو حمید احمد خاں ایسے اکابر کے کارناموں سے درس بینش حاصل کرنے کا موقع مل سکے گا۔

اس ایڈیشن کے سلسلے میں سید وقار عظیم صاحب کے مخلصانہ تعاون کے لئے دل کی گہرائیوں سے شکرگزار ہوں

چھٹی کُل پاکستان کانفرنس

گزشتہ دنوں انجمن ادبی رسائل کی چھٹی کل پاکستان کانفرنس کا افتتاح مولانا کوثر نیازی وزیر اطلاعات و نشریات، حج و اوقاف کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مولانا موصوف نے انجمن کے پیش کردہ ۱۵ مطالبے تسلیم کرتے ہوئے اعلان فرمایا ہے کہ ۱۵ر مئی ۱۹۷۴ء تک ان مطالبوں پر عمل در آمد کا فیصلہ ہوجائے گا۔ ہماری دعا ہے کہ ملک کے علمی، ادبی اور فنی رسالوں کو زندہ رہنے کے اسباب مہیا ہوجائیں۔ تاکہ وہ بھی پاکستان کی ذہنی اور فکری تعمیر میں یک سوئی سے حصہ لے سکیں۔

صہبا لکھنوی

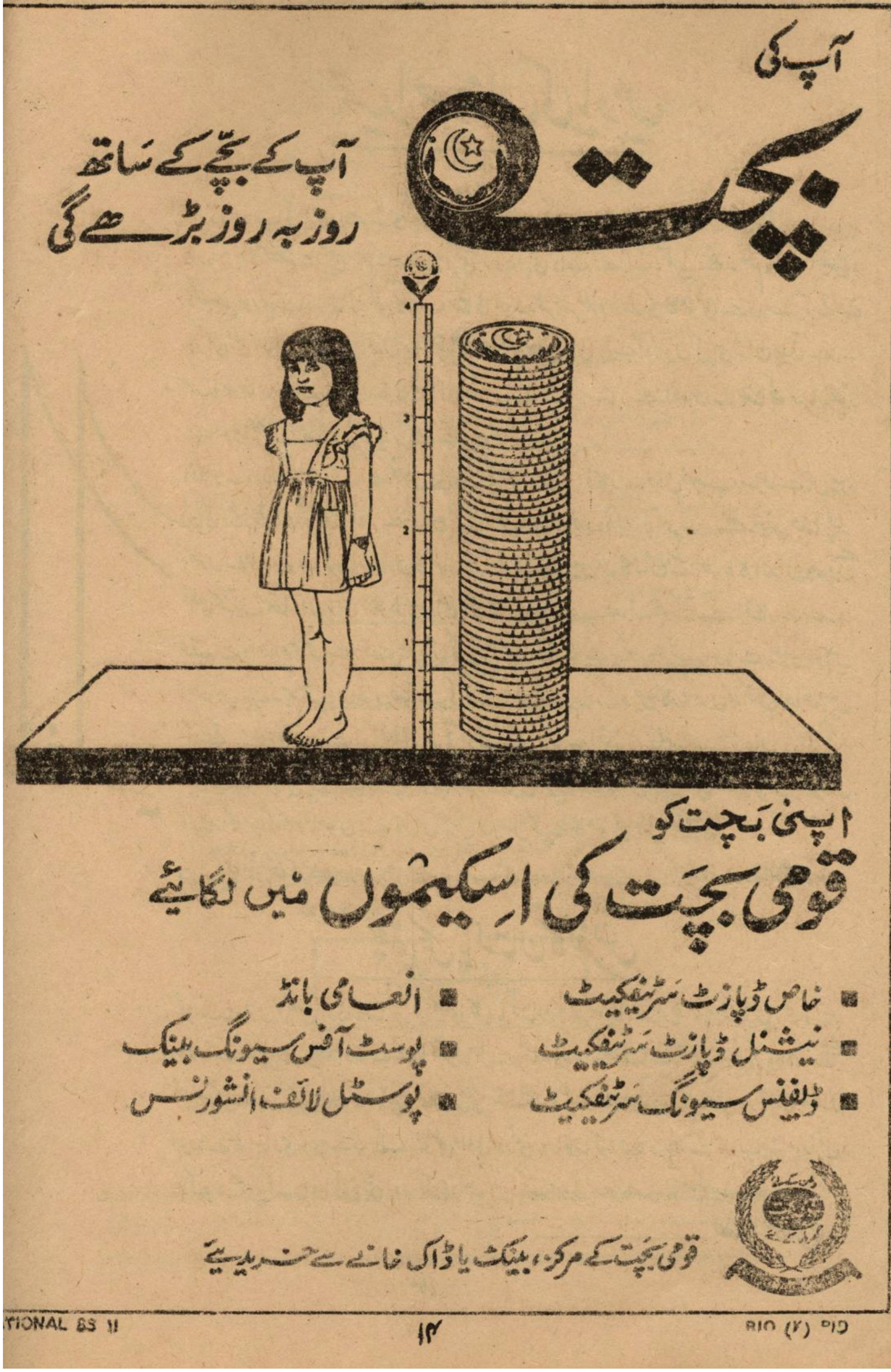
آپ کی
بچت
آپ کے بچّے کے ساتھ
روز بہ روز بڑھے گی
اپنی بچت کو
قومی بچت کی اسکیموں میں لگائیے
■ خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ
■ انعامی بانڈ
■ نیشنل ڈپازٹ سرٹیفکیٹ
■ پوسٹ آفس سیونگ بینک
■ ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ
■ پوسٹل لائف انشورنس
قومی بچت کے مرکز، بینک یا ڈاک خانے سے خریدیئے

ادارہ

زندگی، شخصیت اور فن کا مختصر جائزہ

پیدائش :- لاہور - یکم نومبر ۱۹۰۳ء
وفات :- لاہور - ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء

تعلیم

۱- بی - اے عثمانیہ یونیورسٹی (۱۹۲۶ء)
۲- ایم - اے (انگریزی) پنجاب یونیورسٹی (۱۹۲۹ء)
۳- ایم - لٹ ۔ کیمبرج یونیورسٹی (۱۹۵۴ء)

عہدے جن پر فائز رہے

۱- پروفیسر و صدر شعبۂ انگریزی، اسلامیہ کالج، لاہور (یکم مارچ ۱۹۴۸ء تا ۳۰ اپریل ۱۹۵۸ء)
۲- پرنسپل اسلامیہ کالج، لاہور (یکم مئی ۱۹۵۸ء تا ۳۱ اگست ۱۹۶۳ء)
۳- وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی (یکم ستمبر ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۹ء)
۴- چیف ایڈیٹر و شریک ڈائرکٹر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور (۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء)
۵- ناظم، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور (۱۹۷۰ء تا وفات ۱۹۷۴ء)

تخلیقات

تقریباً ۳۵ سال تک اردو اور انگریزی میں ادبی، تعلیمی اور معاشرتی و تہذیبی موضوعات پر مضامین، مقالات اور خطبات جو انگریزی اور اردو کے معروف رسالوں میں اور مختلف رپورٹوں کی صورت میں شایع ہوتے رہے۔ مندرجہ ذیل کتابیں شایع ہوئیں :

۱- اسوۂ حسنہ (۱۹۶۶ء)
۲- دیوانِ غالب (نسخۂ حمیدیہ) ۱۹۶۹ء)

پروفیسر حمید احمد خاں (مرحوم)

۳۔ ارمغان حالی (۱۹۷۰ء)

"اقبال کی شخصیت اور شاعری" اور "تعلیم و تہذیب" کے نام سے دو کتابیں اس وقت زیرِ طبع ہیں۔ مضامین کے چند مجموعے طباعت و اشاعت کے منتظر ہیں:

۱۔ ادب، ادیب اور معاشرہ
۲۔ قومی اور ملی تقاریر و مضامین
۳۔ اسلام اور حریت انسانی
۴۔ ہر ملک ملک ماست (عالمی سیر و سیاحت کے کوائف)
۵۔ تنقید غالب پر مضامین

اعزازات

۱۔ ستارۂ امتیاز (۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء)
۲۔ ستارۂ پاکستان (اگست ۱۹۶۸ء)

بین الاقوامی اداروں کی رکنیت

۱۔ رکن، کوئٹیکر سیمینار زفار ساؤتھ ایسٹ ایشیا (۱۹۵۹ء — ۱۹۶۰ء) کے سہ ہفتہ سیمینار کا افتتاح کیا اور "PEACE IN OUR CHANGING WORLD" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔
۲۔ یونیسکو فیلو (ایجوکیشنل لیڈر ٹریول گرانٹ) (۱۹۶۰ء)
۳۔ ایشین امریکن اسمبلی، کوالالمپور (وفد کے قائد کی حیثیت سے شرکت کی) (۱۹۶۳ء)
۴۔ ایشین افریکن اسلامک کانفرنس جکارتا ۱۹۶۴ء، بندونگ ۱۹۶۵ء (دونوں موقعوں پر پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے شرکت کی) (۱۹۶۴ء — ۱۹۶۵ء)
۵۔ وائس چیرمین ایفرو ایشین اسلامک آرگنائزیشن (۱۹۶۵ء)
۶۔ رکن انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف یونیورسٹی پریسیڈنٹس (۱۹۶۵ء)

دوسرے اداروں سے وابستگی

۱۔ صدر، غالب میموریل کمیٹی، لاہور (۱۹۶۷ء — ۱۹۶۹ء)
۲۔ صدر، مرکزی اردو بورڈ، لاہور (۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۲ء)
۳۔ صدر، گوئٹے انسٹی ٹیوٹ (۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۳ء)

بابائے اردو — اردو کانفرنس لاہور میں (۱۹۵۹ء)
پروفیسر حمید احمد خاں خطاب فرمارہے ہیں۔ حاضرین میں مولوی محمد شفیع (مرحوم)
مولانا صلاح الدین (مرحوم) حمید نظامی (مرحوم) کے علاوہ (دوسری صف میں)
بیگم تاثیر اور حکیم جلیل احمد (مرحوم)

بابائے اردو— اسلامیہ کالج لاہور میں
(دائیں سے) پروفیسر عابد احمد علی۔ پروفیسر حمید احمد خاں۔ بابائے اردو
مولوی غلام محی الدین قصوری (مرحوم)

پروفیسر حمید احمد خاں

غیر مطبوعہ اور یادگار خطوط

اپنے بیٹے ــــــ سعید احمد خاں کے نام

کیمبرج
۹ نومبر ۱۹۵۲ء   پونے دس بجے شب

عزیز من سعید احمد خاں صاحب !

کل آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں۔ لیکن چونکہ آپ کے دو خط آئے ہیں۔ اس لیے میں بھی دوسرا خط لکھتا ہوں۔

آپ کے پیدل سکول جانے اور آنے سے بہت خوشی ہوئی۔ صرف یہ خیال رکھنا چاہیے کہ آدمی موٹر یا تانگے کے سامنے نہ آجائے۔ اس سے زیادہ خوشی آپ کے ہوائی جہاز کا ذکر پڑھ کر ہوئی کہ وہ ابھی تک ٹھیک ہے۔ مجھے، یہ ہوائی جہاز یاد ہی نہیں رہا تھا۔

(یہاں تک کل لکھا تھا۔ اب باقی ۱۰ نومبر کو ۵½ بجے شام لکھ رہا ہوں۔ امی کی طرف جو خط بھیج رہا ہوں وہ پرسوں لکھنا شروع کیا تھا۔ آج شام ۵ بجے ختم ہو سکا)

آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ میرا خط بدخط تھا، میں اُسے ٹھیک نہیں سمجھتا۔ آپ کا خط بہت اچھا تھا اور بدخط بالکل نہیں تھا۔ میں نے اسے بڑی آسانی سے پڑھ لیا تھا۔ امی نے آپ کے خط پر آپ کا جو جواب لکھا ہے وہ بھی بہت پُرلطف ہے۔ مجھ سے اُلٹا ہاتھ ملایا تو کیا ہوا، ہاتھ ملا تو لیا۔

ایک دن مجھے جمیل نشتر نے TRINITY اور ST JOHN'S کالج دکھائے۔ جمیل نشتر سردار عبدالرب نشتر کا بیٹا ہے اور یہاں سینٹ جانز کالج میں پڑھتا ہے۔ بڑا نیک اور شریف لڑکا ہے۔ ٹرنٹی کالج میں بڑے بڑے آدمی پڑھ چکے ہیں۔ لارڈ مکالے جیسے ادیب، نیوٹن جیسے سائنس داں، ٹینی سن اور بائرن جیسے شاعر یہاں تھے۔ جمیل نشتر نے ان کے بُت مجھے دکھائے۔ علامہ اقبال جب کیمبرج آئے تھے تو اسی کالج میں پڑھتے تھے۔ ٹرنٹی کا بڑا گھڑیال بھی دیکھا۔ یہ ہر گھنٹے کو دو مرتبہ بجاتا ہے ــــ

(مثلاً پہلے ایک سُر میں دو بجتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی دوسرے سُر میں دوبارہ دو بجتے ہیں) ٹرنٹی کا کورٹ (یعنی اندر کا چوکور صحن) کیمبرج کے سب کالجوں سے بڑا ہے۔ جب گھڑیال بارہ بجاتا ہے تو اُس عرصے میں اس کالج کا جو لڑکا کورٹ کا پورا چکر بھاگ کر پورا کرے وہ بڑا بہادر سمجھا جاتا ہے۔ تم کو یہ خیال رہے کہ گھڑیال دو مرتبہ بارہ بجاتا ہے۔ لیکن پورے کورٹ کا چکر اتنا بڑا ہے کہ ۲۴ مرتبہ ٹن ٹن ہوتے ہوتے بھی بھاگنے سے پورا نہیں ہوتا۔ پچھلی صدی میں ایک لڑکے نے ٹن ٹن ہوتے ہوتے چکر پورا کر لیا تھا۔ اس کے بعد کسی سے نہیں ہوسکا۔ مگر اب بھی لڑکے کوشش ضرور کرتے ہیں۔ ٹرنٹی کے بڑے کورٹ کی اور دوسری تصویریں پھر بھیجوں گا۔

اس خط کا آخری حصہ جلدی میں لکھا ہے اس لیے مشکل لکھا گیا ہے۔ امی سے کہیے کہ وہ آپ کو سمجھا دیں۔

ابا

سید وقار عظیم کے نام

سینٹ ہال، لاہور

۲۳ راگست ۱۹۶۷ء

برادر عزیز و مکرم!　　السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ مؤرخہ ۱۸ راگست جس کے ساتھ اردو کانفرنس کے نام پیغام کا مسودہ شامل تھا، دو تین دن ہوئے ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ لیکن اس سے بڑا شکریہ اس بات کا کہ آپ لاہور سے چند روز کے لیے نکل گئے، جس سے آپ کے مضمحل اعصاب کو کچھ سکون ملا۔ اگر آپ یہ نہ کرتے تو اپنے آپ پر اور یونیورسٹی پر ظلم کرتے۔

میں نے دراصل بدحواسی کے عالم میں سعید کے انٹرویو کا ذکر آپ سے کر دیا۔ وہ بُلاوا ESSO کی طرف سے تھا، نہ کہ LEVER BROS. کی طرف سے۔ میرے حواس نے "ملاّ کی دوڑ مسجد تک" کے فلسفے پر عمل کیا اور ESSO کو بھی لیور برادرز قرار دے دیا۔ بہرحال سعید کے اس انٹرویو کا نتیجہ اکتوبر میں معلوم ہوگا۔

آج صبح سید شمشاد حیدر کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ بچاری عرصے سے بیمار اور سخت تکلیف میں تھیں۔ موت بہرحال باعثِ رنج ہوتی ہے۔ لیکن شاید مرحومہ کے لیے پیہم تکلیف سے نجات کی صورت بھی یہی تھی۔

گھر میں سب کو درجہ بدرجہ سلام و دعا کہہ دیجیے۔

خاکسار حمید احمد خاں

احمد علی خاں اور ہاجرہ مسرور کے نام

(۱)

لاہور ۲۸ رجون ۱۹۶۶ء

برادرم احمد علی خاں اور ہاجرہ بہن!　السلام علیکم

عید الفطر کے موقع پر آپ کا تہنیت نامہ مل کر باعثِ مسرت ہوا۔ یاد آوری کے لیے میرا دلی شکریہ قبول فرمایئے۔ میں آپ کی صحت اور اطمینانِ خاطر کے لیے دست بہ دعا ہوں۔ بچوں کو بے شمار دلی دعائیں۔ گزشتہ چند مہینوں میں لاتعداد

موقعے ایسے آئے کہ آپ سب بے اختیار اور بار بار یاد آئے۔ غالب کا کثرت سے استعمال ہونے والا شعر اگرچہ زیادہ تر غلط تقریب سے سستی عبارت میں گھسیٹ لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں میرے حسب حال ہے۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اتفاق سے وائس چانسلروں کی کمیٹی کا مرکز نقل کراچی سے راولپنڈی میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ جو آپ لوگوں کی صورت دیکھنے کا بہانہ گاہ بگاہ پیدا ہو جاتا تھا، اُس سے بھی فی الحال محروم ہو گیا ہوں۔

خیر طلب حمید احمد خاں

(۲)

سینٹ ہال، لاہور ــــ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۶ء

برادرم احمد علی خاں صاحب!　　السلام علیکم

امید ہے آپ، ہاجرہ بہن اور بچے بخیریت ہوں گے۔

میں ۲۸ ستمبر کی شام کو کراچی آنے کا ارادہ رکھتا ہوں ــ ۳۰ ستمبر کو مجھے غالب پر ایک مختصر سا مقالہ پڑھنا ہے، ۲۹ ستمبر کا دن آوارہ گردی میں صرف کرنے کا خیال ہے یکم اکتوبر کو واپس لاہور روانگی ہو گی۔

آپ براہِ کرم مجھے بواپسی اطلاع دیجیے کہ "میرا کمرہ" خالی ہو گا یا اسی زمانے میں کوئی اور مہمان آپ کے ہاں تشریف لا رہے ہیں۔ باقی ملاقات پر ــــ

خاکسار　حمید احمد خاں

(۳)

پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس، لاہور ــ ۷ فروری ۱۹۶۹ء

برادرم احمد علی خاں، ہاجرہ بہن! ــــ السلام علیکم

آپ کا ۴ فروری کا لکھا ہوا خط کل مل کر باعثِ شکریہ ہوا۔

چانسلر کی یہ خواہش کہ میں طویل رخصت پر چلا جاؤں، مجھے ناگہانی طور پر ۳ فروری کی صبح کو وزیر تعلیم نے پہنچائی۔ اگرچہ اتنا تو معلوم تھا کہ ایجوکیشن سکریٹری میرے خلاف غصے سے اُبل رہے ہیں اور لاہور کے طلبہ کو اپنے سرکاری STUDENT'S AFFAIRS DEPT. میں بلوا بلوا کر چائے پلاتے ہیں۔ مگر یہ خیال نہ تھا کہ اُن کی کوششیں ۳ فروری ہی کو اس خاص شکل میں بارآور ہوں گی۔ ایجوکیشن سکریٹری، یوں تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سے بھی بہت ناراض ہیں۔ مگر کراچی دور ہے اور کم از کم یہ ممکن نہیں کہ کراچی یونیورسٹی کے طالب علم چائے اور پیسٹری کے ذریعے سے ورغلائے جائیں۔ بہرحال . . . . . وہ اُن کو تکلیف پہنچانے کے لیے شاید کوئی اور صورت اختیار کریں۔

گزشتہ ساڑھے پانچ برس کی خدمت کے عوض مجھے ساڑھے پانچ مہینے کی چھٹی (تنخواہ پر) مل سکتی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اسی چھٹی کے دوران میں مکان کی تلاش جاری رکھوں اور ممکن ہو تو آیندہ دو تین مہینے میں کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاؤں۔ میرا بیگم روڈ والا مکان گزشتہ سال اپریل میں کرایے پر اٹھ گیا تھا اور ممکن ہے کہ ابھی کچھ عرصے تک کرایہ دار وہاں سے نہ نکلے۔ اس لحاظ سے میرا ڈاک کا پتا ابھی دو تین مہینے تک شاید وہی رہے، جو میں نے اوپر

موقعے ایسے آئے کہ آپ سب بے اختیار اور بار بار یاد آئے۔ غالب کا کثرت سے استعمال ہونے والا شعر اگرچہ زیادہ تر غلط تقریب سے سستی عبارت میں گھسیٹ لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں میرے حسب حال ہے۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اتفاق سے وائس چانسلروں کی کمیٹی کا مرکز نقل کراچی سے راولپنڈی میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ جو آپ لوگوں کی صورت دیکھنے کا بہانہ گاہ بگاہ پیدا ہو جاتا تھا، اُس سے بھی فی الحال محروم ہو گیا ہوں۔

خیر طلب حمید احمد خاں

(۲)

سینٹ ہال، لاہور ——۲۲ ستمبر ۱۹۶۶ء

برادرم احمد علی خاں صاحب!　　السلام علیکم

امید ہے آپ، ہاجرہ بہن اور بچے بخیریت ہوں گے۔

میں ۲۸ ستمبر کی شام کو کراچی آنے کا ارادہ رکھتا ہوں ۔— ۳۰ ستمبر کو مجھے غالب پر ایک مختصر سا مقالہ پڑھنا ہے، ۲۹ ستمبر کا دن آوارہ گردی میں صرف کرنے کا خیال ہے یکم اکتوبر کو واپس لاہور روانگی ہوگی۔

آپ براہِ کرم مجھے بواپسی اطلاع دیجیے کہ "میرا کمرہ" خالی ہوگا یا اسی زمانے میں کوئی اور مہمان آپ کے ہاں تشریف لا رہے ہیں۔ باقی ملاقات پر——　　خاکسار　حمید احمد خاں

(۳)

پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس، لاہور ——۷ فروری ۱۹۶۹ء

برادرم احمد علی خاں، ہاجرہ بہن!——السلام علیکم

آپ کا ۴ فروری کا لکھا ہوا خط کل مل کر باعثِ شکریہ ہوا۔

چانسلر کی یہ خواہش کہ میں طویل رخصت پر چلا جاؤں، مجھے ناگہانی طور پر ۳ فروری کی صبح کو وزیر تعلیم نے پہنچائی۔ اگرچہ اتنا تو معلوم تھا کہ ایجوکیشن سکریٹری میرے خلاف غصّے سے اُبل رہے ہیں اور لاہور کے طلبہ کو اپنے سرکاری STUDENT'SAFF AIRS DEPT. میں بلوا بلوا کر چائے پلاتے ہیں۔ مگر یہ خیال نہ تھا کہ اُن کی کوششیں ۳ فروری ہی کو اس خاص شکل میں بار آور ہوں گی سا ایجوکیشن سکریٹری۔ یوں تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سے بھی بہت ناراض ہیں۔ مگر کراچی دور ہے اور کم از کم یہ ممکن نہیں کہ کراچی یونیورسٹی کے طالب علم چائے اور پیٹری کے ذریعے سے ورغلائے جائیں۔ بہر حال۔ . . . . وہ اُن کو تکلیف پہنچانے کے لیے شاید کوئی اور صورت اختیار کریں۔

گزشتہ ساڑھے پانچ برس کی خدمت کے عوض مجھے ساڑھے پانچ مہینے کی چھٹی (تنخواہ پر) مل سکتی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اسی چھٹی کے دوران میں مکان کی تلاش جاری رکھوں اور ممکن ہو تو آیندہ دو تین مہینے میں کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاؤں۔ میرا بیگم روڈ والا مکان گزشتہ سال اپریل میں کرایے پر اٹھ گیا تھا اور ممکن ہے کہ ابھی کچھ عرصے تک کرایہ دار وہاں سے نہ نکلے۔ اس لحاظ سے میرا ڈاک کا پتا ابھی دو تین مہینے تک شاید یہی رہے، جو میں نے اوپر

لکھا ہے۔ اس میں تبدیلی ہوئی تو اطلاع دوں گا۔

ادارۂ یادگار غالب کی طرف سے کوئی بلاوا مجھے نہیں ملا۔ لیکن اگر اُن کی طرف سے دعوت آئی بھی تو بصورت موجودہ میرا کراچی کا سفر اختیار کرنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

بچوں کو دعا کہہ دیجیے۔ یہاں سے سب خورد و کلاں آپ کو سلام بھیجتے ہیں۔

خاکسار حمید احمد خاں

(۴)

۵ بیگم روڈ، لاہور — ۱۲ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

ہاجرہ بہن، برادر عزیز احمد علی خاں!　　　سلام مسنون —

آپ دونوں کا نوازش نامہ ستمبر کے آخری دنوں میں مل گیا تھا۔ میں کسی ایسے دن کا منتظر تھا کہ مجھے ذرا سا حقیقی اطمینان میسر ہو تو مزے سے بیٹھ کر آپ کو خط لکھوں۔ سو اب میری کیفیت کسی قدر تفصیل سے سن لیجیے۔

۵ار جولائی کو میں عثمانی صاحب کے بُلاوے پر ایک مجلس مشاورت میں شرکت کرنے کے لیے اسلام آباد گیا اور وہاں سے بیمار ہو کر واپس گھر آیا۔ پہلے شدت کا زکام ہوا، پھر ناک بند ہو گئی اور مہینہ بھر بند رہی اور اس حد تک بند کہ رات کو سونا دشوار ہو گیا۔ اگست کے آخر میں کچھ افاقہ ہوا تو ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ شیخ محمد اکرام جو ۱۹۶۶ء سے اس ادارے کے ڈائرکٹر ہیں۔ گزشتہ فروری۔ مارچ ہی سے مُصر تھے کہ میں "ایڈیشنل ڈائرکٹر اور چیف ایڈیٹر" کی حیثیت سے اُن کے ادارے سے منسلک ہو جاؤں۔ تنخواہ ساڑھے پندرہ سو ۱۵۰۰ ہے۔ جب میں اسلامیہ کالج کا پرنسپل تھا تو مجھے یہی تنخواہ ملتی تھی۔ اب چونکہ روپے کی قیمت کچھ اور گر گئی ہے اور میرے خانگی اخراجات کچھ بڑھ گئے ہیں۔ اس لیے پراویڈنٹ فنڈ سے جمع شدہ جو تھوڑی بہت رقم بنک میں ہے اُس میں سے چار پانچ سو روپیہ ماہ بماہ نکلوا کر اپنی آمدنی میں "اضافہ" کرتا ہوں۔ بچے اس وقت سب کے سب زیر تعلیم ہیں، دو مدرسے میں، دو کالج میں، اور ایک لاہور کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں۔ سب سے بڑا امریکہ میں کیمیکل انجینئرنگ کر رہا ہے۔ یہ انشاءاللہ آیندہ سال واپس آ جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ اُسے ابھی سے لاہور کے قریب کھاد کے ایک کارخانے میں (جو تیار ہو رہا ہے) انجینئر کی اسامی کی پیش کش ہو گئی ہے، یعنی کہا گیا ہے کہ یکم دسمبر ۱۹۷۰ء کو آ کر کام سنبھالو۔ الغرض میرے ذاتی حالات اگر اس وقت بہت اچھے نہیں ہیں تو آیندہ دو ایک برس میں کچھ بہتر امیدیں ضرور ہیں۔

میرا کام ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں ادارے کی طرف سے شایع ہونے والی کتابوں کو اشاعت سے پہلے پڑھنا اور "ایڈٹ کرنا" ہے۔ چنانچہ پچھلے مہینے ہادی حسین کی انگریزی کتاب "سید احمد خاں" پر یہ عمل کر چکا ہوں۔ اب اپنے اُستاد خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی انگریزی کتاب "رسول اکرم اور اُن کا پیغام" اسی طرح دیکھ کر "ایڈٹ" کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے سپرد یہ کام ہے کہ خود بھی کتابیں لکھوں۔ اگلے سال کے دوران میں مجھے "دانش سعدی" (یعنی شیخ سعدی کی زندگی اور اُن کا فلسفۂ زندگی) لکھنی ہے اور ساتھ ہی خواجہ حالؔی کی نظم و نثر کے انتخابات "ارمغان حالی" کے نام سے تیار کرنے ہیں۔

اچھا اب بہن ہاجرہ سنیں کہ یہ دونوں اُن کتابوں میں سے نہیں ہیں جن کے لکھنے کے پروگرام میں عمر بھر بناتا رہا۔

بہر حال خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ یہ "کتابیں" تو ہیں جو کتابیں لکھنے کی آرزو اب بھی دل میں ہے۔ اُن میں سے ایک کتاب تو غالب پر ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد میں مسلمانانِ ہند کے خاص تمدن کا تجزیہ شامل ہے (ذہنی طور پر یہ تجزیہ ہو چکا ہے، اور بے شمار NOTES کی شکل میں موجود ہے جو میرے گھر پر پڑے ہیں!) دوسری کتاب (انگریزی میں) ورڈز ورتھ پر ہے۔ اس کا دو تہائی حصہ (جس طرح غالب والی کتاب کا ایک تہائی حصہ) لکھا جا چکا ہے۔ میرے خیال میں اب ہم آپ ایک کاروباری سمجھوتا یہ کر لیں کہ آپ میرے لیے مسلسل دُعا کریں کہ میں غالب اور ورڈز ورتھ پر اپنی کتابیں مکمل کر سکوں اور میں آپ کے لیے دعائیں کرتا رہوں کہ آپ کو اپنے اسی قسم کے پروگراموں کی تکمیل کا موقع ملے!

ستمبر میں کراچی یونیورسٹی نے مجھے اپنے انگریزی کے اُستاد مقرر کرنے کے سلسلے میں کراچی آنے کی دعوت بھیجی۔ افسوس ہے کہ اُس بیماری کی وجہ سے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں میں یہ دعوت قبول نہ کر سکا، ورنہ آپ دونوں سے ملنے کا ایک موقع بن جاتا۔ خیر دسمبر اب کیا دور ہے، آپ لوگ لاہور آئیں گے تو ملاقات ہوگی۔

یہ عجیب اتفاق ہوا کہ جولائی۔ اگست۔ ستمبر کا زمانہ میں نے تو بیماری اور پریشانی میں گزارا ہی، آپ کو بھی اُس دوران میں یہی منزلیں طے کرنی پڑیں۔ خدا کرے کہ احمد علی خاں اب بالکل بخیریت ہوں۔

میری بیوی اور بچے سب بخیریت ہیں اور آپ کو سلام کہتے ہیں۔ ہم ۹ رمئی کو یونیورسٹی میں اپنے یک سالہ قیام کے بعد، بوریا بستر باندھ کر پھر اپنے مکان پر پہنچ گئے تھے۔ مئی۔ جون۔ جولائی میں سامان کا بڑا حصہ کھُل کر نئی ترتیب سے ٹھکانے لگ گیا۔ مگر "آبادکاری" کا یہ عمل ابھی پورا نہیں ہوا کہ خصوصاً میری کتابیں اور کاغذات ابھی تک میری بے ہمتی سے نالاں ہیں۔ اتوار کے اتوار ان پر کچھ توجہ کرتا ہوں۔

نوید اور جیکو کو بہت بہت دعا۔　　خیر طلب حمید احمد خاں

(۵)

۵ بیگم روڈ لاہور ــــ ۲۸ر مارچ ۱۹۷۰ء

برادرم احمد علی خاں اور ہاجرہ بہن!　　السلام علیکم ــــ

امید ہے آپ سب بخیریت ہوں گے۔ اس دوران میں میری موجودہ نوکری کی مسلسل مصروفیت ایسی رہی کہ کبھی آپ کو خط لکھنے کا یارا نہیں ہوا۔

میں ایک مہینے کے سفر پر امریکہ روانہ ہو رہا ہوں۔ انشاء اللہ مئی کے شروع میں واپس پاکستان آجاؤں گا۔ روانگی سے پہلے یہاں کے کام کسی طرح نہ نبٹ سکے، اس لیے بالکل آخری وقت میں چل رہا ہوں اور آپ کی ملاقات سے بھی محروم رہوں گا۔ پیر منگل کی درمیانی رات کو کراچی پہنچ کر اسی رات آگے روانہ ہوں گا۔

اس سفر کے لیے دعوت ایشیا سوسائٹی نیو یارک کی طرف سے آئی تھی۔ پانچ سات یونیورسٹیوں میں غالب پر بات کرنی ہو گی۔ سعید ابھی تک امریکہ میں ہے۔ شاید اس سے بھی ملاقات کا موقع ملے گا۔ "شاید" اس لیے کہتا ہوں کہ میرے امریکی میزبانوں نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر ایک بے ڈھنگا پروگرام بنا دیا ہے۔ میں نے اُنھیں لکھا ہے کہ مجھے اپنے بیٹے سے ملنے کا موقع بھی عنایت فرمائیں۔ عجیب لوگ ہیں۔ ایسے موقعوں پر انگریزوں کی شائستگی یاد آتی ہے۔

یہاں سب چھوٹے بڑے آپ کو یاد کرتے اور سلام کہتے ہیں۔ بچوں کو بہت بہت دعا۔

خیر طلب حمید احمد خاں

(۶)

لندن۔ ۴ رمئی ۱۹۷۰ء

برادرم احمد علی خاں اور ہاجرہ بہن ! السلام علیکم ——

میں امریکہ سے واپس لندن آ پہنچا ہوں اور اب انشاء اللہ ہفتے کے دن (۹ رمئی کو) صبح سوا دو بجے کراچی پہنچوں گا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس میں تبدیلی کرا کے ۷ رمئی کی شام یا رات کو کراچی پہنچ جاؤں۔ افسوس ہے کہ یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ PAN AMERICAN اور P.I.A دونوں رات بھر کے سفر کے بعد صبح سویرے کراچی پہنچاتے ہیں۔ اور ۸ رمئی کی صبح کو PAN AMERICAN کا ناغہ بھی ہے۔

اب ناچار ۸ رمئی کی شام کو ۴ بجے استنبول سے چل کر ۹ رمئی کو ایک "جناتی" وقت پر کراچی وارد ہوں گا۔ اور صرف ایک دن کراچی میں گزار کر ۱۰ رمئی کو صبح ۸ بجے کے جہاز سے لاہور جاؤں گا۔ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ لندن سے ایک دن پہلے چلوں اور کراچی کے لیے دو دن نکال لوں، مگر یہ ممکن نہیں ہو سکا۔

سوا دو بجے یا ڈھائی بجے کراچی پہنچنے کے بعد کسٹم والے خاصا وقت لے لیں گے۔ اس لیے آپ (یعنی صرف احمد علی خاں صاحب) اگر ۳ بجے تک بھی آ جائیں تو سہولت ہوگی۔ لیکن اگر نہ آئیں تو بھی مکان تو مجھے معلوم ہی ہے۔ میں ٹیکسی لے کر پہنچ جاؤں گا۔

ہاں اگر یہ خط وصول ہو جائے اور احمد علی خاں ایئر پورٹ آ سکیں تو اپنے ساتھ دو ڈھائی سو روپیہ ضرور لیتے آئیں۔ میں نے اپنے پانچوں لڑکوں کے لیے کوٹ پتلون وغیرہ چیزیں یہاں سے خریدی ہیں۔ ممکن ہے کسٹم والے تکلیف دیں۔

امید ہے آپ سب بخیریت ہوں گے۔ ہاں جس ہوائی جہاز سے آ رہا ہوں اس کا نمبر PA2 ہے۔

والسلام۔ حمید احمد خاں

(۷)

۵ بیگم روڈ لاہور —— ۷ رمارچ ۱۹۷۲ء

برادر عزیز ! السلام علیکم ——

میں جمعے، ہفتے اور اتوار کے لیے کراچی آ رہا ہوں۔ سائینٹفک سوسائٹی (پاکستان) کا سالانہ جلسہ کراچی یونیورسٹی میں ہو رہا ہے اور سوسائٹی کے ارباب حل و عقد مُصر ہیں کہ میں مذاکرے میں ضرور شرکت کروں۔ سہولت کے لیے میں یونیورسٹی میں قیام کروں گا۔ لیکن ۱۰ رمارچ سے ۱۲ رمارچ کی تاریخوں میں کسی شام (جب آپ بھی گھر پر ہوں) میں ضرور آپ سب سے ملنے کو آؤں گا۔

ہاجرہ بہن کو سلام۔ بچوں کو دعا۔　　　　مخلص حمید احمد خاں

شان الحق حقّی کے نام

۲۵ مئی ۱۹۷۲ء

برادرم حقی صاحب !　　السلام علیکم

آپ کے دونوں عطیے، ایک ہی گراں بہا کل کے دو جز، گذشتہ دو ہفتوں میں سرچشمۂ لطف و سرور بنے رہے۔ حق یہ ہے کہ 'نکتۂ راز' اگر متن ہے اور "گلدستۂ نگارش" اس کا حاشیہ، تو اس حاشیے کے بغیر وہ متن ناتمام سا رہتا۔ نکتۂ راز کے نکتہ رس قارئین، یقیناً محترمہ سلمیٰ حقی کے سپاس گزار ہوں گے کہ ان کے ادبی سلیقے اور نفاست ذوق نے صدف 'نکتہ راز' کے لیے اظہار وابلاغ کا عمل بکمال حسن اہتمام پیدا کر دیا۔ تعقل و تصور کے نازک ترین سانچوں میں ڈھلی ہوئی وہ مجموعی شخصیت جس کا نام شان الحق حقی ہے، اس نظم و نثر، اس محاکات و مزاح، اس حال و قال کو ترکیب دیے بغیر ذہن میں مکمل طور پر ابھر نہیں سکتی تھی۔

الحمد للہ اب ہماری نثر اس دور میں داخل ہو گئی کہ الفاظ انکشاف حقیقت کا ذریعہ ہیں نہ کہ وہ کھوکھلی قلم کاری کا شعبدہ۔ ثقافت و معیشت کے باب میں آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ کم از کم پاکستانی معاشرے کے لیے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

سود کی حرمت و حلت کے مسئلے پر میرے دوست شیخ محمود احمد، سابق ناظم تعلیمات، آزاد کشمیر نے بھی ایک اسی قسم کا فکر افروز مقالہ مرتب کیا ہے۔ اس کی کوئی نقل مل گئی تو عنقریب آپ کی خدمت میں بھیجوں گا) رسم الخط کے موضوع سے بحث کر کے آپ نے اسے آئینے کی طرح روشن کر دیا ہے۔ اس بحث میں حسن معنی کے ساتھ حسن بیان کا امتزاج بجائے خود ایک خاص لطف رکھتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

میں نے آپ کے یہ دونوں عطیے سخن فہم دوستوں میں گردش کے لیے روانہ کر دیے ہیں۔ دعا کیجیے کہ گردش کا یہ عمل بالآخر دونوں کتابوں کو دوبارہ میرے پاس لے آئے۔

ایک گلہ باقی رہا۔ انٹنی اور کلیوپیٹرا کے منظوم ترجمے کا نقش اول اپنی ناتمامی کے باوجود فریادی ہے کہ مجھ سے بے اعتنائی کیوں روا رکھی گئی۔ یہ ایک بے زبان کی شکایت ہے (کاغذی پیرہن میسر ہوا بھی تو کیا!) مگر اب میں نے قلم ہاتھ میں لیا ہے، تو یہ شکوہ پہنچانے میں کوتاہی کیوں کروں؟ جواب اس شکوے کا میری سمجھ میں تو ایک ہی آتا ہے۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ سب دوستوں کی خدمت میں میرا سلام پہنچے۔

مخلص

حمید احمد خاں

محسن بھوپالی کے نام

مکرمی ـــــ سلام مسنون

جستہ جستہ کو پہلے جستہ جستہ اور پھر تمام و کمال پڑھا۔ بیہم لطف و سرور حاصل ہوا۔ حالیؔ، اکبر اور اقبال

نے حقائقِ گردوپیش پر اپنے اپنے رنگ میں، ناقدانہ تبصرے کی جو روایت قایم کی تھی، اسے آپ نے ایک بار پھر زندہ کر دیا۔ یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ منطقی تعریف کا وہ نازک سا نشتر جو سیاست و معاشرتِ حاضرہ کی رگِ جاں میں چُبھ کر باعثِ انشراحِ خاطر ہو۔ خدا نے آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں۔ "منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے" ایک نئے افق کا انکشاف ہے۔ کتاب میں اس قسم کے انکشافات سے آپ کے قارئین اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہرہ یاب ہوتے ہیں، اور ہوتے رہیں گے۔

میخانے کی توہین ہے، رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

زیست ہمسائے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں

علم رسوا ہے شاہراہوں پر
جہل پلتا ہے خانقاہوں میں

تاریخ لکھی ہوتی ہے بین السطور میں!

غنچوں نے آنکھ کھول کے دیکھا تو دھوپ تھی
جھونکا نسیمِ صبح کا جانے کدھر گیا

تھی مسئلے سے بڑھ کے جنھیں مصلحت پسند
وہ لوگ جان بوجھ کے انجان ہو گئے

لیکن طنز کے علاوہ روشنیٔ دل و دماغ تک پہنچنے کے اور بھی راستے ہیں جن کی نشان دہی آپ نے جابجا کی ہے۔

اے مرے ہم نفسو، ہم قلمو، نغمہ گرو،
کتنے موضوع سرِ راہ صدا دیتے ہیں
پیکرِ ذات سے باہر تو نکل کر دیکھو
کتنے ذرّے ہیں کہ سورج کا پتہ دیتے ہیں

اور پھر وہ راستے جن کی تلاش میں ہر کسی کا قدم نہیں اٹھتا، مگر جس کسی کا قدم اٹھتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک نئے جہانِ معنی میں پاتا ہے۔

غمِ محبوب و غمِ دہر و غمِ جاں کی قسم ایسے غم بھی ہیں یہاں جن کا کوئی نام نہیں

الغرض اس عجائب خانے کا گوشہ گوشہ اربابِ ذوق و بصیرت کو صلائے عام دیتا ہے۔ اللّٰھم زد فزد

والسلام۔ حمید احمد خاں

پروفیسر حمید احمد خاں

رسالتمآب کے عہد میں

حقوق انسانی

حمید احمد خاں صاحب مرحوم کو "رسالت مآب کے عہد میں حقوقِ انسانی" کے موضوع پر ریڈیو پاکستان، لاہور سے دس منٹ کی تقریزنشر کرنی تھی۔ تقریر لکھنی شروع کی وہ ذرا طویل ہو گئی۔ چنانچہ مرحوم نے اُس کے بعض حصّے حذف کر کے اُسے ریڈیو کی ضرورت کے مطابق بنا لیا۔ تقریر اُن کے انتقال کے گیارہ دن بعد ریڈیو پاکستان، لاہور سے نشر ہوئی۔ ذیل کا مضمون تقریر کا مکمل متن ہے اور اس میں وہ حصّے بھی موجود ہیں جو نشری تقریر میں شامل نہیں کیے گئے تھے۔ مرحوم انتقال سے پہلے یونیسکو کے لیے غالب پر انگریزی میں ایک کتاب لکھ رہے تھے اور پنجاب یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے اقبال کے نظامِ فکر پر ایک خطبہ لکھنے میں مصروف تھے۔ یہ دونوں کام ادھورے رہ گئے۔ اس لحاظ سے ذیل کا مضمون مرحوم کی آخری مکمل تحریر ہے۔

ہمارے ہادی و مولا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بیک وقت حقوق خداوندی کے احترام کی تعلیم بھی فرمائی اور حقوقِ انسانی کے احترام کی بھی۔ اس تعلیم کا حاصل دین اسلام ہے۔ چودہ سو برس ہوئے لفظ اسلام ایک دینی اصطلاح کے طور پر پہلے پہلے استعمال ہوا۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس ایک جامع لفظ کے اصطلاحی مفہوم کا تجزیہ بار بار کیا گیا ہے۔ اور اس کے مختلف پہلوؤں پر طرح طرح سے نظر ڈالی گئی ہے۔ خود قرآنِ حکیم اپنی اس نئی وضع کردہ اصطلاح کی تصریحات سے معمور ہے اور حدیث وسنت کا عظیم الشان سرمایہ ایک اور رنگ میں اس اصطلاح کی تصریحات سے معمور ہے اور حدیث وسنت کا عظیم الشان سرمایہ ایک اور رنگ میں اس اصطلاح کی تفسیر و تشریح ہے۔ دنیائے اسلام کی عقلی تاریخ اس لفظ کی معنویت اور اس معنویت کے ممکنات کو ظاہر کرنے کی مسلسل کوشش ہے۔ یہ پرانا سبق کبھی پرانا نہیں ہو سکتا۔ اس کی دعوتِ فکر و عمل آج بھی اس طرح تازہ ہے جس طرح صدہا برس پہلے تھی۔ چنانچہ ہمارا کام دورِ حاضر میں یہ ہے کہ حقایق اسلام کو اپنے زملنے کے فہم و بصیرت کے نئے سانچوں میں ڈھالیں اور یوں اس ازلی صداقت سے ربط پیدا کریں جس کا سرچشمہ زمان و مکان کی حدود سے پرے ہے۔

اسلام کو انسان کے مادی و روحانی اور انفرادی و اجتماعی نظامِ حیات دونوں سے یکساں تعلق ہے۔ جو بے شمار مسائل اس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہمیں اس وقت صرف ایک مسئلے سے، اور اس مسئلے کے بھی چند نمایاں پہلوؤں سے سروکار ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام نے عالمِ عمرانی میں انسان کو کیا مقام عطا کیا، یعنی معاشرے کی تنظیم میں انسان بحیثیت انسان کی اہمیت کس حد تک تسلیم کی۔ یہاں انسان بحیثیت انسان کی ترکیب خصوصیت سے قابلِ لحاظ ہے۔ انسان کبھی بادشاہ یا جاگیردار اور برہمن یا اسقف بھی ہوتا ہے۔ لیکن ان حیثیتوں میں جو عظمت اُسے حاصل ہو، وہ بحیثیتِ انسان اُس کی عظمت نہیں کہلا سکتی۔ برہمن سے اُس کی برہمنیت کو منفی کر دیں تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو دھرم نے اُسے بحیثیتِ انسان کیا عمرانی مقام دیا ہے۔ چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے اپنے نظامِ سیاست و معاشرت میں انسان بحیثیت انسان کا ایک خاص مرتبہ تسلیم کیا تو مراد یہ ہوتی ہے کہ اسلام کے نزدیک انسان کی ایک فضیلت ایسی ہے جو اسے ہر حال میں میسر رہتی ہے، خواہ وہ انسان عربی ہو یا عجمی، یہودی ہو یا مشرک، بادشاہ ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، برہمن ہو یا شودر۔

انسان کو اس بنیادی فضیلت کا میسر ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اُس کا جوہرِ انسانیت نسل، نسب اور جنس، وطن، قوم اور سیاست کی زنجیروں سے آزاد ہے۔ حریتِ انسانی کا یہ مفہوم تاریخ میں اُس وقت نمودار ہوا جب بنی آدم کی عظیم الشان اکثریت کو انفرادی یا نسلی، نسبی یا مذہبی اقتدار کے نیچے دبے ہوئے ہزاروں برس گذر چکے تھے۔ رسولِ اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں صاف اعلان کر دیا۔

لیس للعربی فضل علی العجمی ولا للعجمی فضل علی العربی۔ کلکم ابناء آدم

(عرب کو غیر عرب پر اور غیر عرب کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ تم سب اولادِ آدم ہو)

انسان کی جماعتی تنظیم اسلام نے جن نئے تصورات پر قایم کی۔ ان میں انسان کی ذاتی حریت کے مسئلے کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ اب اسلام کے قایم کردہ نظامِ عمرانی میں اب ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان بندگی کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اس اسلامی تصور کو علامہ اقبال نے بجا طور پر ایک انقلابی تصور قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اسلام عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔"

انقلابِ ضمیر کی اس کوشش کے پیچھے اصل الاصولِ اسلام یعنی عقیدۂ توحید ہے۔ مسلمان جب اقرار باللسان کے ذریعے سے اپنے اسلام پر گواہی دیتا ہے تو وحدانیتِ ذاتِ باری تعالیٰ کا اعلان ھو اللہ احد کے مثبت دعوے کے ذریعے سے نہیں کرتا بلکہ لا الہ الا اللہ کے منفی دعوے کو زبان پر لا کر سب سے پہلے اینٹ پتھر کے ہر بت اور گوشت پوست کے ہر مجسمے کی خدائی کا انکار کرتا ہے۔ اس پہلی منزل پر اسقف اور حبر اور پروہت، وزیر اور حاکم اور افسر کی بندگی ختم ہو جاتی ہے اور پھر خدا اور اس کے بندے کے درمیان کوئی تیسری ہستی حائل نہیں رہتی۔

پچھلی قوموں میں یہود کی نظر بھی اسلامی توحید سے ملتے جلتے ایک تصور تک پہنچی تھی۔ لیکن ان کی محرومی یہ تھی کہ انھوں نے خدائے واحد کو محض ربِ بنی اسرائیل قرار دے کر بنی آدم سے عقیدۂ توحید کی محیط الکل رحمتیں چھین لیں۔

اسلام کا خدا ئے واحد رب العلمین ہے ۔ رب السمٰوات والارض ہے ۔ رب المشرقین ورب المغربین ہے ۔ پھر یہی نہیں، اسلام کے خدا کا دامانِ رحمت غیر مسلموں کے لیے بھی وسیع ہے ۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسولؐ پاک سے کفار کے متعلق اس طرح خطاب فرمایا ہے ۔

لیس لک من الامر شیئ اویتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظلمون ۔ وللّٰہ مافی السمٰوٰت وما فی الارض یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء ۔ واللّٰہ غفور الرحیم ۔

(سورہ آل عمران ۲۸ - ۱۲۷)

اس سے بڑھ کر یہ کہ اسلام کا خدا کسی انسانی جماعت کو محض اس کے باطل عقائد کی بنا پر برباد نہیں کرتا ۔ چنانچہ سورۂ ہود میں ارشاد ہوا ہے : وما کان ربک لیھلک القریٰ بظلم واھلھا مصلحون ۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اس آیۂ کریمہ کا ترجمہ یوں کیا ہے ۔ "اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو کفر کے سبب ہلاک کر دے اور ان کے رہنے والے اصلاح میں لگے ہوں ۔

ذاتِ باری کے اس رفیع الشان تصور نے معاشرتی انصاف کا ایک ایسا نصب العین دنیا کے سامنے پیش کیا کہ اسلام تمام نبی نوع انسان کے لیے امن وسلامتی کا پیغام بن گیا ۔ حضور رسالت مآبؐ نے اپنے پیغام کے اس پہلو کو ہمیشہ خاص طور پر نمایاں کیا ۔ نجاشی بادشاہ حبش کو جو مکتوب مبارک گیا ۔ اس کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں ۔" (بندگانِ خدا کے ساتھ) تعدّی چھوڑ دے ۔ میں تجھے اور تیرے عساکر کو خدا کی طرف بلاتا ہوں"۔ کسریٰ کے نام یہ عبارت تحریر فرمائی ۔ "مجھ کو خدا نے تمام دنیا کے انسانوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ ہر زندہ انسان کو (عذاب گناہ سے) ڈراؤں ۔"

الغرض جب خدا اور رسولؐ نے دنیا کے ہر انسان کو اپنی توجہ کا مستحق گردانا تو انسانی وقار کا پایہ خود بخود بلند ہو گیا ۔ اور اس طرح حریت اسلامی کا تصور مستحکم بنیادوں پر قائم ہوا ۔ لیکن اس تصور کی حیثیت محض نظری یا شرعی ہی نہیں ہے ۔ اس کی ایک عملی یعنی تاریخی حیثیت بھی ہے ۔ یہ بالکل درست ہے کہ کسی مسئلے کو علمی طور پر ثابت کر دینے سے اس کی عملی حیثیت خود بخود ثابت نہیں ہو جاتی ۔ اب ذرا تاریخ سے شہادت لیجیے کہ اسلام نے عملاً حریت انسانی کا احترام کس حد تک کیا ۔ بنی نوع انسان کے لیے حضورؐ کے انکسار اور تواضع کی یہ کیفیت تھی کہ مدینے کی ایک مجذوب سی عورت نے اپنے کسی کام کے لیے حضورؐ کو راہ چلتے روک لیا تو شہنشاہِ عرب دیر تک سرِ رہ گزار بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا ۔ بایں ہمہ حضورؐ کے رعب و وقار کا یہ عالم تھا کہ فتح مکہ کے دن ایک شخص نے حضورؐ کی خدمت میں آکر کچھ عرض کرنا چاہا تو جلال نبوی نے اس کے بدن پر لرزہ طاری کر دیا ۔ آپؐ نے اس شخص کو اس طرح تشفی دی ،" گھبراؤ مت ۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ایک غریب قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی ۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ، جو جناب رسول کریمؐ کے پہلے جانشین اور خلافت اسلامیہ کے اولین رکن ہیں ، ان یادگار زمانہ الفاظ میں اپنے جلیل القدر منصب کا جائزہ لیا ۔ "لوگو ! میں اگرچہ تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں ، تاہم تمہارا سردار مقرر کیا گیا ہوں ۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری تائید کرو ، اور اگر مجھ سے کوئی خطا سرزد ہو تو میری اصلاح کر دو ۔ ...... جب میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں تو تم بھی میری اطاعت کرو اور جب میں اس سے انحراف

کروں تو تم پر بھی میری اطاعت فرض نہیں۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اپنے دور خلافت کا آغاز ان روح پرور الفاظ سے کیا تھا جن کے متعلق ولندیزی مستشرق وگوبجے بجا طور پر کہتا ہے کہ ان کا طلسم کبھی ٹوٹنے نہ پائے گا۔" خدا کی قسم، تم میں سب سے زیادہ ناتواں میری نگاہ میں سب سے زیادہ توانا ہوں گے، تاوقتیکہ میں ان کے حقوق ان کو دلوا نہ لوں۔ لیکن جو تم میں سب سے زیادہ توانا ہے اس کو سب سے زیادہ ناتواں سمجھوں گا، تاوقتیکہ وہ قانون کے آگے اپنا سر جھکا نہ دے۔"

اور یہ محض زبانی دعویٰ ہی نہیں تھا۔ خلافت فاروقی کے متعدد واقعات اس کی تائید میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں شاید سب سے زیادہ عبرت آموز بنو غسان کے سردار جبلہ بن الایہم کا واقعہ ہے، جسے علامہ شبلی نے تو براہ راست حضرت عمر کے تعلق سے بیان کیا ہے لیکن علامہ ابن قتیبہ نے اسے حضرت ابو عبیدہ جراح سے متعلق کیا ہے اور غالباً یہی روایت زیادہ صحیح بھی ہے۔ ابن قتیبہ کا بیان یہ ہے، جبلہ بن الایہم غسانیوں کا آخری بادشاہ تھا۔ اس نے عمر ابن الخطاب کے عہدِ خلافت میں اسلام قبول کیا۔ لیکن بعد میں پھر مسیحی ہو گیا اور دولت بازنطین میں جا کر مقیم ہوا۔ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا۔ کہ ایک دن وہ گھوڑے پر سوار دمشق کے بازار میں سے گزر رہا تھا کہ تماشائیوں میں سے ایک کا پاؤں اس کے گھوڑے کے سم کے تلے آ گیا۔ اس شخص نے اُچک کر جبلہ کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ غسانیوں نے اسے گرفتار کر کے ابو عبیدہ جراح کے سامنے استغاثہ کیا کہ اس شخص نے ہمارے رئیس کو مارا ہے۔ ابو عبیدہ نے جب پوچھا کہ تمھارے دعوے کا کیا ثبوت ہے، تو جبلہ نے ان سے کہا کہ آپ ثبوت کس غرض سے چاہتے ہیں؟ ابو عبیدہ نے جواب دیا کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ مدعا علیہ نے تمھیں طمانچہ مارا ہے تو تم کو بھی اس کے بدلے میں اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارنے کی اجازت دی جائے گی۔ جبلہ یہ سن کر حیران رہ گیا، اور پوچھنے لگا کہ کیا یہ شخص مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی پاداش میں قتل نہ کیا جائے گا؟ اور جب ابو عبیدہ نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا تو بدیں خیال کہ اس کے مرتبے کا کچھ تو خیال کیا جائے گا، پوچھنے لگا کہ کیا اس کا داہنا ہاتھ بھی نہ کاٹا جائے گا؟ ابو عبیدہ نے سختی سے کہا کہ ہرگز نہیں۔ خدا نے صرف برابر کا بدلہ لینے کی اجازت دی ہے۔ جبلہ یہ سُن کر رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے رومی علاقے میں جا کر عیسائیت اختیار کر لی اور باقی عمر وہیں گزاری۔

لیکن اس قسم کے واقعات گنانے سے کہیں زیادہ اہم یہ سوال ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے سیاسی حقوق کی کہاں تک پاس داری کی۔ اس سلسلے میں اُس مہتم بالشان سند کے الفاظ کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو رسولِ کریم نے کوہ سینا کے قریب کی مسیحی خانقاہ سینٹ کیتھرن کے راہبوں اور تمام عیسائی قوم کو عطا کی تھی۔ اس سند میں عیسائیوں کے جان و مال، اُن کے کلیسا اور پیشوایان مذہب کے مکانات کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی گئی۔ مسیحیوں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی۔ اس بات کی بھی ضمانت دی گئی کہ جو مسیحی عورتیں مسلمانوں کے نکاح میں ہیں۔ ان پر تبدیلِ مذہب کے لیے ہرگز جبر نہیں کیا جائے گا۔ ساتھ ہی یہ یقین دلایا گیا کہ اگر عیسائیوں کو اپنے گرجاؤں یا خانقاہوں کی مرمت کے لیے مدد کی ضرورت ہوئی تو مسلمانوں پر ان کی مدد لازم ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کا بھی اعلان کر دیا گیا کہ اگر کوئی مسلمان ان مراعات کا احترام نہ کرے گا تو وہ احکامِ ربانی کو توڑنے والا اور

خدا کے دین کی خلاف ورزی کرنے والا سمجھا جائے گا۔

یہ سند بجائے خود ایسی حیرت انگیز رواداری کا ثبوت دے رہی ہے کہ اس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی بے نظیر نوعیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے اگر اس امر کا لحاظ کیا جائے کہ یہ کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہے جو دو برابر کی طاقتوں کے درمیان ہو رہا ہو۔ مسلمانوں کو اس وقت مدینے پر پورا غلبہ حاصل ہو چکا ہے اور عیسائیوں کی حیثیت اس چھوٹی سی اسلامی جمہوریہ میں محض ایک چھوٹی سی کمزور جماعت کی ہے۔ گویا زبردست زیردست کو، غالب مغلوب کو اس انداز سے امن اور سلامتی کا یقین دلا رہا ہے کہ اس پر غور کرنے سے انسانی ضمیر میں آج بھی ایک عجیب وسعت اور بلندی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس سند کے ساتھ بارگاہِ نبوت کے اس فرمان کو ملا کر دیکھا جائے جو اس طریقے پر نجران کے عیسائیوں کے حق میں صادر ہوا اور جس کی توثیق خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں بھی ہوئی، تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ جب حضرت عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت میں دمشق کے مسیحی اسقف کی زبان سے، ہم ذیل کے کلمات سنتے ہیں۔ "یہ عرب جن کے ہاتھ میں خدا نے آج کل ہماری قسمت کی باگ دے رکھی ہے۔ مذہب عیسوی کے خلاف جنگ نہیں کرتے، بلکہ ہمارے دین کی حمایت کرتے ہیں۔ ہمارے پیشوایان مذہب اور اولیائے ملت کو نگاہ احترام سے دیکھتے ہیں اور ہمارے کلیساؤں اور خانقاہوں کو عطیے اور تحائف دیتے ہیں۔" حضرت علی مرتضیٰؓ کا عہد آیا تو انھوں نے فرمایا کہ "ذمی (یعنی مسلمانوں کے زیر پناہ غیر مسلم) کا خون مسلمان کے خون کے برابر ہے۔" خلفائے راشدین کا احساس اس معاملے میں اس قدر لطیف تھا کہ حضرت عمرؓ نے بستر مرگ پر لیٹے لیٹے جو وصیت کی اس میں بھی یہودی و عیسائی اقلیت کو فراموش نہیں کیا۔ ان کے الفاظ یہ تھے: "وہ شخص جو جانشینی کے لیے منتخب کیا جائے اس کو میری یہ آخری استدعا پہنچا دینا کہ اس شہر (یعنی مدینہ منورہ) کے لوگوں سے جس نے ہمیں اور دین حنیف کو پناہ دی، بہ ملاطفت پیش آئے.. اور یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں اسے چاہیے کہ رسول اللہؐ نے جو قول انھیں دیا تھا، اسے ایمان داری سے پورا کرے۔"

جنگی قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی جو مثال حضور رسول مقبولؐ نے قایم کی دنیا کو اس سے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ قیدیوں کی گرفتاری کے بعد آنحضرتؐ سب سے پہلے ان کے لباس کی فکر کیا کرتے تھے اور بسا اوقات انھیں فدیہ لیے بغیر رہا کر دیتے تھے۔ غزوہ حنین کے بعد رسول اللہؐ اور صحابہ نے مجموعی طور پر چھ ہزار قیدی اس طرح آزاد کر دیے تھے۔ قیدیوں کی تواضع معزز مہمانوں کی طرح کی جاتی تھی۔ مسلمان اُن کے آرام و آسائش کے لیے اپنی راحت و آسودگی کو قربان کرنے میں دریغ نہ کیا کرتے تھے۔ غزوۂ بدر کے ایک قیدی نے اپنی رہائی کے بعد اپنی اسیری کی کیفیت اس طرح بیان کی: "مسلمانوں پر اللہ کی رحمت ہو! وہ اپنے اہل و عیال سے اچھا ہمیں کھلاتے تھے اور اپنے کنبے سے پہلے ہمارے آرام کی فکر کیا کرتے تھے۔" یہ حضور رسولِ مقبولؐ کی خاص شانِ رحمۃ اللعالمین ہے کہ مسلمان صلح و جنگ دونوں حالتوں میں انسانی ہستی کا بنیادی حق یعنی انسان کا ذاتی احترام کبھی فراموش نہیں کرتا۔

وصلی اللہ علیٰ نور کزو شد نور ہا پیدا

ڈاکٹر سید معین الرحمن

بابائے اردو اور پروفیسر حمید احمد خاں

(ایک انٹرویو)

سنہ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر سید معین الرحمن نے پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم سے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے بارے میں ایک انٹرویو لیا تھا۔ اس میں ضمنی طور پر خود حمید احمد خاں کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں آگئی ہیں جو آج ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ انٹرویو "قومی زبان" کے سنہ ۱۹۶۶ء کے بابائے اردو نمبر میں شایع ہوا تھا، اسے قومی زبان کے شکریے کے ساتھ شایع کیا جاتا ہے۔

———— صہبا

انجمن ترقیٔ اردو (پاکستان) کراچی کی جانب سے بابائے اردو کی ذات گرامی سے متعلق پروفیسر حمید احمد خاں صاحب سے گفتگو کرنے کے لیے میں بھاول نگر سے لاہور پہنچا تھا۔ یہ ۷ ارجون سنہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ میں صبح سے کوشاں تھا کہ ملاقات کے لیے وقت لیا جا سکے۔ کئی بار اقامت گاہ اور یونیورسٹی میں ٹیلیفون پر رابطے کی ناکام کوشش کرکے مضمحل ہو چکا تھا کہ شام گئے کہیں پانچ بجے کے قریب حمید احمد خاں صاحب سے بات ہو سکی اور جس محبت، اپنائیت اور شفقت سے انھوں نے گفتگو فرمائی، اُس نے مجھے نئے سرے سے تازہ کار کر دیا۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب تعلیم اور تعلّم سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ اُن کی ساری عمر درس و تدریس میں گزُری ہے۔ اُن کا شمار ملک کے ایک گنے ماہرینِ تعلیم میں ہوتا ہے۔ پچھلے چھتیس سال سے وہ مختلف ادبی و فکری اور تعلیمی و تاریخی موضوعات پر فکر انگیز اور پُر مغز مقالات و مضامین لکھ رہے ہیں۔ وہ خوب گھومے پھرے بھی ہیں۔ انھوں نے دنیا دیکھی ہے۔ سنہ ۱۹۵۲ء سے اب تک وہ ہمہ جہتی مقاصد سے برطانیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی، ترکی، یونان، امریکہ، ملایا اور انڈونیشیا وغیرہ کی سیاحت کر چکے ہیں۔ خدا کی طرف سے انھیں فکر روشن عطا ہوئی ہے۔ سیاحت نے اس پر پرش کا کام کیا ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب یکم نومبر سنہ ۱۹۰۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے سنہ ۱۹۲۶ء میں بی۔ اے کیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور سنہ ۱۹۵۴ء میں جب وہ اسلامیہ کالج، لاہور میں شعبہ انگریزی کے صدر تھے، کیمبرج یونیورسٹی سے ایم۔ لٹ کیا۔ دس سال شعبہ انگریزی کے پروفیسر اور صدر رہنے کے بعد سنہ ۱۹۵۸ء میں وہ اسلامیہ کالج، لاہور ہی کے پرنسپل ہو گئے اور اب اگست سنہ ۱۹۶۳ء سے پنجاب یونیورسٹی

کے وائس چانسلر ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں انھوں نے امریکن فرینڈز سروس انٹرنیشنل سیمینار کا افتتاح کیا۔ اپریل ۱۹۶۳ء میں وہ ایشین امریکن اسمبلی منعقدہ کولالمپور میں شریک ہوئے اور گروپ چیرمین کی باوقار خدمت انجام دی۔ جون ۱۹۶۴ء اور پھر امسال مارچ میں انھوں نے افرو ایشیائی اسلامی کانفرنسوں میں پاکستانی وفد کے قائد کے طور پر شرکت کی اور بڑی سرگرمی۔ اُن کی ہمہ جہت علمی و تہذیبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی طرف سے انھیں "ستارۂ امتیاز" کا اعزاز عطا کیا گیا۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب بڑی دل نواز شخصیت کے مالک ہیں۔ طبعًا وہ بزرگوں کی اُس نسل کی باقیات میں سے ہیں، جو وضع بنھانا اور تہذیبی اقدار کو برتنا جزو ایمان جانتی ہیں بہ ایں ہمہ وہ جدت، اختراع اور اپچ کے دشمن نہیں۔ وہ مشرقی تہذیب کے ورثہ دار ہیں۔ لیکن جدید علوم و افکار اور ان کے فضائل سے مجتنب نہیں۔ وہ بے حد شائستہ اور شستہ ہیں اور اچھی، سچی اور کام کی بات کو قبول کرتے اور پھر اسے چلن دینے میں بڑے جری ہیں۔ آرٹس اور سائنس کے مضامین میں اردو کو اعلیٰ مدارج تک ذریعہ تعلیم کے بطور اختیار کرنے کی تحریک اور پنجاب یونیورسٹی میں عملاً اس کا نفاذ، ان کا یادگار اور سدا بہار کارنامہ ہے۔ وہ انگریزی کے استاد ہیں اور اردو کے سچے عاشق ہیں۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے انھیں بے انتہا ارادت ہے۔ وہ ایک اعتبار سے بابائے اردو ہی کے تربیت یافتہ ہیں اور ان طالع وروں میں ہیں جنھیں بابائے اردو کی رفاقت کار کا موقع تو بے شک نہ ملا۔ لیکن ان کی چشم نگراں ضرور میسر آئی۔

میں لاہور میں اجنبی نہیں تھا۔ لیکن راہوں اور شاہراہوں سے کچھ ایسا واقف بھی نہ تھا۔ آٹھ بجے مجھے یونیورسٹی پہنچنا تھا۔ مغل پورہ سے جہاں میرا قیام تھا، میں سات بجے ہی چل دیا۔ سینٹ ہال پہنچا تو آٹھ بجا چاہتے تھے حمید احمد خاں صاحب کام میں منہمک تھے، مگر بڑے تپاک سے ملے، فرمایا:۔

> "میں بچپن سے مولوی عبدالحق صاحب کے نام اور کام سے واقف ہوں مجھے ان کے رفیق کار ہونے کی سعادت تو نصیب نہیں ہوئی، تاہم میرا شمار قوم کے اُن بے شمار افراد میں کیا جا سکتا ہے۔ جنھیں بابائے اردو کے جذبۂ ایثار و جہاد سے بے انتہا عقیدت تھی۔ مجھ پر اُن کی شفقت ہمیشہ عام رہی اور نیازمندی کا ربط اور رشتہ آخر دم تک قایم رہا۔"

آپ مولوی صاحب کے رفیق کار نہ رہے ہوں اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ میں مولوی صاحب سے متعلق کسی خاص بات کی کرید میں آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ مولوی صاحب سے آپ کے لحاظ اور نیاز کے رشتے کی داستان سننے کا چسکا مجھے کشاں کشاں آپ کی خدمت میں لایا ہے۔ آپ کا حافظہ شاید ساتھ دے مولوی صاحب کا نام آپ نے پہلی بار کب سُنا۔"

حمید احمد خاں صاحب مسکرائے۔ لیکن مسکرانا بقول شخصے کسی اور سبب سے اتنا نہ تھا، جتنا شاید میرے اظہار طلاقت لسانی پر، لیکن میں بھی جما رہا۔

"آپ بچپن سے مولوی صاحب کے نام سے واقف رہے ہیں۔ کوئی ایسا نقش کہ پہلا نقش کہہ سکیں جسے، آپکے

ذہن میں ضرور ہوگا "۔ حمید احمد خاں صاحب کچھ دیر یادوں کا تعاقب کرنے کے بعد کچھ یوں گویا ہوئے ۔

"میرے علاقی برادر بزرگ مولانا ظفر علی خاں اور بابائے اردو نے علی گڑھ میں سید احمد خاں مرحوم کے زیر سایہ ایک ہی زمانے میں تعلیم پائی ۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن میں بھی دونوں کسی نہ کسی حیثیت سے باہم وابستہ رہے ۔ دسمبر ۱۹۰۹ء میں جب والد مرحوم و مغفور سراج الدین احمد خاں بانی و مدیر " زمیندار " کا انتقال ہوا تو مولانا ظفر علی خاں حیدر آباد سے خارج البلد ہو کر واپس وطن پہنچ چکے تھے ۔ میں اس وقت چھ برس کا بچہ تھا ۔ لیکن مجھے اطلاع ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب اُس زمانے میں والد مرحوم کی وفات پر تعزیت کے لیے ہمارے گاؤں کرم آباد تشریف لائے تھے "

بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ سلیکشن بورڈ کے ارکان یا شاید تاریخ ادب اردو پر مامور اصحاب نے آنا شروع کیا ۔ غالباً کوئی میٹنگ تھی ۔ حمید احمد خاں صاحب نے معذرتاً مجھ سے فرمایا :-

"اس ہنگامے میں کچھ نہ ہو سکے گا ۔ آپ دوسرے کمرے میں تشریف رکھیے ۔ میٹنگ سے فرصت ملے تو اطمینان کے ساتھ آپ سے باتیں ہوں گی "

اور ساتھ ہی انھوں نے اپنے سکریٹری اصغر احمد نثار صاحب کو کچھ اس طرح کی ہدایت کی کہ مجھے بٹھایا جائے، کچھ کھلایا پلایا جائے ۔

وائس چانسلر روم میں میٹنگ کوئی تین گھنٹے جاری رہی ۔ اس دوران نثار صاحب مختلف النوع کاموں میں الجھے رہنے کے باوجود میری دل داری سے غافل نہیں ہوئے ۔ میٹنگ کے بعد حمید احمد خاں صاحب نے یاد فرمایا، تعظیم دے کر بٹھایا، شرمسار کیا، اور اس پر بے حد افسوس کا اظہار فرمایا کہ مجھے کافی انتظار کرنا پڑا ۔ خاصی دیر بیکار بیٹھے رہنا پڑا ۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں کہ بابائے اردو سے پہلی ملاقات کیونکر ہوئی ، پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے فرمایا :

"اپنے ہوش میں ان کو پہلی بار دیکھنے کا شرف غالباً ۱۹۲۳ء کے اواخر میں حاصل ہوا ۔ میں اُن دنوں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں ایف ۔ اے کا طالب علم تھا اور اپنے بڑے بھائی پروفیسر محمود احمد خاں صاحب کے ساتھ رہتا تھا ۔ ایک شام بابائے اردو بھائی صاحب سے ملنے کے لیے تشریف لائے ۔ انھوں نے اپنا نام ظاہر نہ فرمایا مگر میں نے قیافے سے سمجھ لیا کہ مولوی عبدالحق صاحب ہیں ۔ دراصل ہوا یوں کہ اُنھوں نے آتے ہی کہا " کیوں بھئی محمود کہاں ہیں ۔ اور یہ تم اس وقت گھر کے اندر کیوں بیٹھے ہو ؟ میں کتاب کا کیڑا ! یہ شام کا وقت تھا اور مولوی صاحب سیر کے عادی ۔ ذرا کی ذرا میں ان نووارد بزرگ کی بازپرس پر گھبرایا ۔ لیکن معاً اندازہ ہو گیا کہ " اوہو ! یہ تو مولوی صاحب ہیں ! " ـــــ

یہ تھا مولوی صاحب سے میرا پہلا سامنا ! ـــــ

میرے ایک اُلجھے ہوئے سوال کے جواب میں کہ بعد کی ملاقاتوں میں کوئی ایسی بات جسے راز کہہ سکیں یعنی کوئی واقعہ یا کسی واقعے کا عقب یا وہ مخصوص حالات جن کے تحت انھوں نے کوئی فیصلہ کیا ہو اور آپ اس میں شریک یا اس سے واقف رہے ہوں اور یا بعض اشخاص اور اداروں وغیرہ کے بارے میں آپ کے سامنے کبھی اظہار خیال کیا ہو تو اس کی تفصیل " حمید احمد خاں صاحب نے فرمایا :-

" ۱۹۳۶ء میں جب میں اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کا لکچرار تھا مولوی صاحب سر سکندر حیات کی حکومت سے اردو زبان کے بارے میں گفت و شنید کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ ان کے قیام لاہور کے درمیان میں اُن سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ مجھے یاد ہے کہ سر سکندر حیات کے نوجوان پارلیمنٹری سکریٹری نواب مشتاق احمد گورمانی سے اردو کی سرکاری حیثیت کے بارے میں مولوی صاحب کی ایک لمبی گفتگو ہوئی اور میں بھی اس گفتگو کے دوران میں موجود تھا "

حمید احمد خاں صاحب نے قدرے توقف فرمایا اور پھر کچھ یوں گویا ہوئے !

" ایک واقعہ مجھے اور یاد آتا ہے۔ غالباً ۱۹۳۶ء کا ذکر ہے۔ مولوی صاحب انجمن ترقی اردو کو حیدر آباد سے منتقل کرنے کا خیال کر رہے تھے۔ شاید اسی سلسلے میں لاہور تشریف لائے تو میں نے گزارش کی کہ انجمن کو لاہور لے آیئے۔ مولوی صاحب کو اس میں تامل تھا اور جب ایک محفل میں میرے دوست ڈاکٹر تاثیر مرحوم، مولوی صاحب سے کسی قدر رد و قدح سے پیش آئے تو مولوی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں اسی وجہ سے لاہور آنے کا فیصلہ کرنے میں متامل ہوں۔ میں نے بعض دوسرے صاحبوں کی طرف اشارہ کیا جو اس محفل میں موجود تھے کہ انھوں نے اس بحث میں حصہ نہیں لیا تھا۔ مولوی صاحب نے فوراً جواب دیا کہ لائی کرگس کے قانون کے مطابق اُن لوگوں کے لیے تازیانے کی سزا ہے جو ایسے وقت سکوت اختیار کریں، جب سچی بات کہنے کا موقع ہو "

میرے ایک سوال کے جواب میں حمید احمد خاں صاحب نے فرمایا :-

" اس کے بعد مولوی صاحب سے کب کب اور کہاں کہاں ملاقات کے مواقع ملے اس کے بیان میں حافظہ ساتھ نہیں دیتا۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک میرا قیام دلی میں رہا اور اس دوران میں مولوی صاحب اور سید ہاشمی فرید آبادی صاحب دونوں انجمن کے دفتر کی دریا گنج والی عمارت میں مقیم تھے۔ یہاں بارہا مولوی صاحب کی خدمت میں باریابی ہوتی رہی۔ جو بات خاص طور پر یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ مولوی صاحب تقریباً ہر ملاقات کو کھانا کھانے یا چائے پلانے کا موقع ضرور بنا لیتے تھے "

میرے ایک سوال کے جواب میں حمید احمد خاں صاحب نے ارشاد فرمایا :-

"جلسوں وغیرہ میں مجھے مولوی صاحب کے ساتھ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ بلکہ اینگلو عربک کالج کے ایک جلسے میں مولوی صاحب کی زیر صدارت میں نے ایک ادبی مقالہ بھی پڑھا اور مولوی صاحب نے اسے رسالہ "اردو" میں چھاپنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ افسوس ہے کہ میں ان دنوں اس مقالے کو اشاعت کے قابل بنانے کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ وہ جلسے میں حتی الوسع وقت پر پہنچنے کی کوشش فرماتے اور جلسے کی غایت اور نوعیت کا پورا پورا خیال رکھتے۔"

بابائے اردو سے اپنی ملاقاتوں کے ضمن میں حمید احمد خاں صاحب نے ایک تقریب کا کچھ یوں ذکر فرمایا:-

"دسمبر ۱۹۵۸ء جنوری ۱۹۵۹ء میں میں نے مولوی صاحب سے یہ درخواست کی کہ وہ اردو کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت کے لیے، جس کا اہتمام ہم لاہور میں کر رہے ہیں۔ لاہور تشریف لائیں۔ بالآخر فروری میں یہ کانفرنس ہوئی اور مولوی صاحب تشریف لائے۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب ایک تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر اسلامیہ کالج لاہور میں بھی تشریف لائے جہاں میں نے "بزم فروغ اردو" کی طرف سے مولوی صاحب کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ اس کے متعلق تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی روداد رسالوں میں چھپ چکی ہے مگر یہ کہنا مناسب ہے کہ مولوی صاحب پر اس تقریب کے دوران میں رقت طاری ہوگئی اور سپاسنامے کے جواب میں انھوں نے جو تقریر کی اُس کا آغاز اُن کی طرف سے ایسی گلوگیر آواز میں ہوا کہ حاضرین میں سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔"

"۱۹۵۹ء کے بعد چند برس مولوی صاحب زیادہ تر کراچی ہی میں رہے۔ آپ سے مراسلت ہوئی ہو شاید؟ اور کراچی میں بھی کیا آپ کی اُن سے کوئی ملاقات ہوئی؟" حمید احمد خاں صاحب نے جواب میں فرمایا:-

"جی ہاں! — آخری چند برس مولوی صاحب زیادہ تر کراچی میں رہے اور کبھی کبھی بذریعہ خط کسی خدمت کی تکمیل کے لیے یاد فرماتے رہے۔ جب میں کراچی جاتا تو انجمن کے دفتر میں مولوی صاحب کی ملاقات کو حاضر ہوتا۔ کراچی کی آخری ملاقات کی یہ کیفیت یاد ہے کہ مولوی صاحب نے کافی منگوائی اور ایک بڑے غیر معمولی گھیر کا بسکٹ کھلایا اور خود بھی کھایا۔"

اس موقع پر ضمناً میں نے دریافت کیا کہ اس دوران میں وہ کس نوع کی خدمات کی تکمیل کے لیے ارشاد فرماتے رہے؟ حمید احمد خاں صاحب مسکراتے ہوئے گویا ہوئے:-

یہ بڑی عام سی باتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً کسی صاحب کا تبادلہ کراچی سے لاہور ہوا تو وہ مولوی صاحب سے ایک تعارفی رقعہ لے کر میرے پاس آئے۔ یا کسی صاحب نے لاہور سے

مولوی صاحب کو لکھا کہ فلاں مقصد کے لیے پیغام بھیجیے۔ یا فلاں مقصد کے لیے مجھے مالی امداد دیجیے۔ تو مولوی صاحب کا خط میرے نام آگیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ بتائیے پیغام بھیجوں یا نہ بھیجوں، مالی امداد دوں یا نہ دوں؟؟

میں نے حمید احمد خاں صاحب سے آخری ملاقات کی تفصیل جاننا چاہی تو وہ پژمردہ سے ہو گئے اور بہ کوشش سنبھلے ہوئے لہجے میں فرمانے لگے:-

"معین صاحب! مولوی صاحب کے ساتھ میری آخری دو ملاقاتوں کی یاد دردناک ہے۔ یہ دونوں ملاقاتیں لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ریل کے ڈبے میں ہوئیں۔

حکیم اسرار احمد صاحب نے مجھے خط لکھا کہ مولوی صاحب صدر ایوب خاں کی دعوت پر معالجے کے لیے جاتے ہوئے فلاں وقت لاہور سے گزریں گے اس ملاقات میں میرے بڑے بھائی، پروفیسر محمود احمد خاں صاحب اور حامد علی خاں دونوں شریک تھے۔ مولوی صاحب کی حالت غیر اطمینان بخش نہیں تھی۔ لیٹے لیٹے بھی وہ اپنے معمول کے مطابق اپنی گفتگو میں شگفتگی؟ اور بذلہ سنجی کا ثبوت دیتے رہے۔ مثلاً کوہ مری کے متعلق فرمایا کہ مقام ہے صحت افزا اور نام پوچھیے تو جواب ملتا ہے کہ "مری"۔ اس کے بعد مولوی صاحب کا سرکاری اہتمام سے ہسپتال میں رہنا کوئی بہتر صورت پیدا کرے گا۔ لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

حکیم اسرار احمد صاحب کے خطوں سے مولوی صاحب کی صحت کے متعلق بہ تنوع تشویشناک خبریں آتی رہیں تا آنکہ یہ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب علاج سے مایوس ہو کر واپس کراچی جا رہے ہیں"

حمید احمد خاں صاحب خاموش ہو گئے وہ بہت تھکے تھکے بجھے بجھے سے دکھائی دے رہے تھے۔ خود میری طبیعت بھی اس احساس سے کہ میں ان کے اضمحلال کا موجب ہوا ہوں، بوجھل ہو گئی۔ میں کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے ان کی آواز سنائی دی، جیسے وہ کہیں بہت دور سے بول رہے ہوں، لرزاں لرزاں، مدھم مدھم!

مولوی صاحب سے آخری ملاقات لاہور ریلوے اسٹیشن پر پھر اسی طرح ریل کے ڈبے میں ہوئی۔ اب مولوی صاحب کی حالت دگرگوں تھی۔ بے حد نحیف ہو چکے تھے۔ حکیم اسرار احمد صاحب مجھے پلیٹ فارم پر الگ لے گئے اور اشک بار آنکھوں سے کہنے لگے کہ اب مولوی صاحب کی زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہی! حکیم صاحب نے بتایا کہ مولوی صاحب کبھی کبھی فرماتے ہیں:- "کسی پہلو چین نہیں آتا"۔ جب میں مولوی صاحب سے ملا تو انھوں نے بہت نحیف آواز میں حکیم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا! "ان کو بتا دیا؟"

اس سے زیادہ مولوی صاحب کچھ نہ کہہ سکے۔ اور حکیم صاحب نے تسلی دی کہ میں نے سب کچھ تفصیل سے بتادیا ہے "

حمید احمد خاں صاحب نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا :۔

" اس اشارے سے مراد یہ تھی کہ مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کی رکنیت سے متعلق اپنی چند خواہشات کا اظہار فرمایا تھا اور یہ چاہا تھا کہ مولانا صلاح الدین احمد، کہ وہ بھی اب مرحوم ہیں، اور میں انجمن کے ارکان شامل ہوں "

میں نے بد تمیزی سے ایک سوال اور کر ڈالا کہ آپ نے مولوی صاحب کے انتقال کی خبر کس طرح سُنی؟ حمید احمد خاں صاحب نے اس بے تکے سوال کے جواب میں بڑے تحمل سے فرمایا :۔

" لاہور ریلوے اسٹیشن پر جب مولوی صاحب کو خدا حافظ کہا تو دل میں یہ یقین تھا کہ اب اس عالمِ اسباب میں پھر ملاقات نہ ہوگی ۔ میری اپنی صحت بھی اُن دنوں اچھی نہ تھی اور لاہور میں گرمی کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ میں خود دوسرے تیسرے دن چند روز کے لیے مری چلا گیا ۔ مجھے مری پہنچے دوسرا ہی دن تھا کہ میں شام کو گھومنے کے لیے نکلا اور ایک بنگلے میں سے شام کی ریڈیو کی خبریں سڑک پر سُنائی دیں ۔ اس طرح مجھے مولوی صاحب کی وفات کی اطلاع ہوئی ۔ باوجود اس کے کہ یہ خبر خلاف توقع نہ تھی دل کو ایک دھکا سا لگا ۔ اب مری میں قیام کا سوال ہی نہ تھا ۔ طبیعت اچاٹ ہوگئی ۔ صبح میں نے رختِ سفر باندھا اور لاہور چلا آیا تاکہ یہاں کے ماتمی جلسوں اور قرار دادوں میں شریک ہوسکوں ۔

اب دبے دبے میں ان خطوں کا طلب گار ہوا جو مختلف مواقع پر بابائے اردو نے انھیں لکھے ۔ حمید احمد خاں صاحب نے بڑی خوش دلی سے فرمایا :۔

" کل صبح آٹھ بجے بلکہ نہیں ۔ آٹھ سے پہلے ہی تشریف لے آیئے، خط لے لیجیے! اس بہانے ایک ملاقات آپ سے اور سہی ! "

میں سراپا نیاز، زیر بار رخصت ہوا ۔ اگلی صبح حمید احمد خاں صاحب نے بابائے اردو کے مکاتیب مرحمت فرمائے، یہ تعداد میں چھ تھے ۔ ان میں سے ایک خط جسٹس ایس ۔ اے ۔ رحمٰن صاحب کے نام تھا ۔ میں نے ان خطوں کی نقل اُن کے پاس بیٹھ کر ہی کی ۔ نقل نویسی کے اس خشک اور بیزار کُن کام میں بھی میں ان کی عنایت اور توجہ سے متمتع ہوا، یعنی میکون اپ نے نرلیش اپ کیا! ۔ آخر آخر میں نے اُن سے سوانحی خاکے کی فرمائش کی تو انھوں نے بے اختیار فرمایا :۔

" ۱۹۰۳ء میں لاہور میں پیدا ہوا اور ارادہ بھی یہیں مرنے کا ہے ۔ تاریخ وفات کا پتہ نہیں ـــــ "

اُن کے سکریٹری اے۔ اے۔ نثار صاحب کی عنایت سے سوانحی خاکہ میسر آگیا۔

پروفیسر حمید احمد صاحب نے انجمن اور اصحاب انجمن کے بارے میں اخلاص اور محبت آمیز جذبات اور کلمات کے ساتھ بڑی عزت و منزلت سے رخصت کیا اور میں نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ اخلاق و انکسار اور عجز و نیاز کی دولت کس قدر ناقابلِ تسخیر ہے اور انسان چاہے تو یہ کتنی آسانی سے ہاتھ آجانے والی بھی ہے۔ لیکن خدا کے ایسے نیک نفس بندے ہیں بڑے خال خال جنھیں یہ نصیب ہوتی ہے۔ اور انسان ذرا سوچے اور غور کرے تو محض اسی ایک بات میں عبرت اور بصیرت کے بڑے سامان پوشیدہ ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے نام بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے مکاتیب حمید احمد صاحب کے دلی شکریے کے ساتھ نقل کیے جاتے ہیں!

(۱)

کراچی

۲۷ر دسمبر[۱] رجسٹرڈ

عزیز مکرم سلمہ اللہ تعالیٰ

آپ کا خط اور جناب ایس۔ اے۔ رحمٰن صاحب کا عنایت نامہ دونوں ساتھ ساتھ پہنچے اور دونوں کو میں نے ساتھ ساتھ پڑھا۔ میں حیران تھا کہ میں اب بھی اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا ہوں۔ شاید آپ نے اہلیت سے زیادہ سفید بالوں کا لحاظ کیا۔ بڑے بوڑھوں کا ادب ہماری قدیم تہذیب میں داخل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک لاہور میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو قدیم تہذیب کے دل دادہ ہیں۔ ورنہ لاہور میں ایسے باکمال حضرات موجود ہیں جن کے سامنے میری کوئی حقیقت نہیں۔ اس لیے میں اسے آپ کی عنایت اور قدامت پرستی پر محمول کرتا ہوں۔ طوالت عمر جس سے میں سخت بیزار ہوں آخر آج کام آہی گئی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں ایسی اہم کانفرنس کی صدارت کا مستحق نہیں۔ یہ از راہ انکسار نہیں بلکہ از راہ حقیقت ہے۔

آپ نے میری اطلاع کے لیے جو امور لکھے ہیں اُن سے آگاہی ہوئی۔ مصلحت کا لفظ دیکھتے ہی تلملا اٹھتا ہوں۔ ان مصلحتوں نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا اور آخر کار ان مصلحتوں نے ہی ہم کو ڈبو دیا۔ جو کہنا ہے صاف کہو اور دو ٹوک کہو۔ ہم کب تک مصلحتوں کی خاطر حق گوئی سے آنکھ مچولی کھیلتے رہیں گے۔ زیادہ کیا کہوں، حالات آپ کے سامنے ہیں۔

---

[۱] ڈاک خانے کی مہر کے مطابق سنہ تحریر ۱۹۵۵ء متعین کیا جا سکتا ہے۔ (معین الرحمٰن)

آپ کی کانفرنس ۱۸ر جنوری کو شروع ہوتی ہے۔ وہاں کب حاضر ہو جاؤں۔ میں وہاں کم سے کم دن رہنا چاہتا ہوں۔ آپ کی ملاقات کا منتظر رہوں گا۔

خیر طلب
عبدالحق

(۲)

کراچی
۱۲ر جنوری ۱۹۵۹ء
عزیز مکرم زاد لطفہٗ

آپ کا خط پہنچا۔ اچھا ہوا آپ نے کانفرنس کی تاریخیں بدل دیں۔ آج کل لاہور میں غضب کی سردی ہے۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ جس روز آپ کا خط پہنچا ہے اُسی روز مس فاطمہ جناح کا بیان موجودہ نظام تعلیم کے خلاف شایع ہوا ہے۔ اس میں زبان کا بھی ذکر ہے۔ ایسے میں کانفرنس کے افتتاح کے لیے ان کا انتخاب بہت موزوں اور مناسب معلوم ہوا۔ میں آپ کے وفد میں شریک ہونے کے لیے بخوشی تیار ہوں۔ مس فاطمہ جناح ہماری درخواست قبول کریں۔ اس کی مجھے کم توقع ہے۔ بہرحال کوشش ضرور ہونی چاہیے۔ اگر انھوں نے یہ درخواست قبول کرلی تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ جو وفد آپ تجویز کریں اس میں لاہور کے دو ایک شخص ضرور ہونے چاہئیں۔

خیر طلب
عبدالحق

(۳)

کراچی
۲۶ر جنوری ۱۹۵۹ء
مکرمی و عزیزی سلمہٗ

آپ کا خط پہنچا۔ مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا کہ جسٹس رحمٰن کا خط فضلی صاحب کے پاس ہے اور وہ مس فاطمہ جناح کی خدمت میں وفد لے جائیں گے۔ فضلی صاحب نے اس بارے میں مجھے کوئی اطلاع ابھی تک نہیں دی۔ آپ نے یہ ضرور لکھا تھا کہ ایسا وفد ترتیب دیا جائے گا اور مجھے بھی اس میں شرکت کے لیے لکھا تھا۔ میں منتظر رہا۔ مجھے مطلق اس کا علم نہیں کہ وفد گیا یا نہیں اور گیا تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ امید

ہے فضلی صاحب کی طرف سے کوئی اطلاع آپ کی یا جسٹس رحمٰن صاحب کی خدمت میں پہنچ گئی ہوگی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب دو ایک روز میں آنے والے ہیں اُن سے پوری کیفیت معلوم ہوگی۔

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی حیرت ہوئی کہ لاہور میں اس تحریک کی مخالفت کی جا رہی ہے میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اردو کی اس قسم کی تحریک کی حمایت اہلِ پنجاب، خاص کر اہلِ لاہور کریں گے اور پاکستان میں اردو پنجاب والوں ہی کے دم سے زندہ رہے گی اور ترقی کرے گی۔ عجب بات ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے اردو ان تمام علاقوں میں مقبول تھی جو اب پاکستان میں شامل ہیں اور اسے قومی زبان سمجھتے تھے۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد سب سے اول مشرقی پاکستان سے مخالفت کی آواز آئی اور اس کے بعد دوسرے صوبوں نے منحرف ہونا شروع کیا۔ باوجود اس کے اب بھی مجھے یقین ہے کہ مغربی پاکستان میں پنجاب ہی کی بدولت اسے فروغ ہوگا۔

خیر طلب
عبدالحق

(۴)

کراچی
۱۵؍ فروری ۱۹۵۹ء
شفیقی و عزیزی سلمہٗ

آپ کا خط ابھی ملا۔ تیز گام میں جگہ نہیں ملی۔ اس لیے شاہین سے ۲۰؍ فروری کو روانہ ہوکر ۲۱؍ فروری کو پونے بارہ بجے لاہور پہنچوں گا۔

میں اپنا خطبہ آج ہی سید عبداللہ صاحب کو بھیج چکا ہوں۔ میں نے زیادہ تر ذریعۂ تعلیم سے بحث کی ہے اور یہی مجھے اس کانفرنس کا مقصد بتایا گیا تھا۔ سُنا ہے کہ سردی وہاں بہت شدت سے پڑ رہی ہے۔ بعض احباب نے لکھا ہے کہ اُدھر کا رُخ نہ کروں۔

لاہور تو ضرور جاؤں گا۔ اگر سردی کی ایسی ہی شدت ہے تو ۲۳؍ کے بعد قیام میرے لیے مناسب نہ ہوگا۔ ویسے اب میں لوگوں سے ملنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ آپ لوگ بہت آگے نکل گئے ہیں۔ مجھے تو اب آپ لوگوں کے سامنے کچھ کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ اب باتیں ملاقات ہی کے وقت ہوں گی۔

خیر طلب
عبدالحق

(۵)

کراچی
۱۹ر-۲ر ۱۹۵۹ء
عزیز مکرم سلمہٗ
آپ کا خط ابھی ملا۔ اس سے پہلے آپ کے خط کا جواب لکھ چکا ہوں پہنچ گیا ہو گا۔ انشاءاللہ ۱۲ر فروری کو شاہین گاڑی سے پونے بارہ بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔
آپ نے یہ سپاس نامے کی پخ کیسی لگا دی۔ میں اس قابل نہیں رہا۔ سپاس نامے وزیروں اور لیڈروں کے لیے ہوتے ہیں۔ میں اب ایک غریب مہاجر ہوں۔ جو کچھ کیا تھا اس پر پانی پھر گیا اور یہاں آکر جو کرنا چاہتا[1] وہ نہ کر سکا بلکہ میرے ساتھیوں نے مجھے اس قابل نہ رکھا کہ کچھ کر سکوں۔ اب سپاس نامہ کس بات کا۔ حرمان و محرومی کا۔ یہ ہنسی کی بات ہو گی۔ آپ میرے دل کے داغ کیوں تازہ کرتے ہیں اور سپاس نامہ پیش کر کے مجھے کیوں شرماتے ہیں۔ اردو کا جو حشر بھارت میں ہوا اور ہو رہا ہے وہ آپ نے دیکھ لیا اور یہاں جو ہو رہا ہے وہ بھی آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ زمانہ سپاس ناموں کا نہیں کچھ کر گزرنے کا ہے۔ آپ اسے موقوف ہی رکھیے تو اچھا ہے میں اسی کو سب سے بڑا سپاس نامہ سمجھوں گا۔
امید ہے آپ میرا منشا سمجھ گئے ہوں گے اور اصرار نہ فرمائیں گے۔

خیر طلب
عبدالحق

---

[1] "تھا" عجلت میں رہ گیا ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں

اردو ادب

سنہ ۱۹۴۵ء — سنہ ۱۹۷۰ء

حکم ہوا ہے کہ اپنے ذاتی تاثرات کو سمیٹ کر گذشتہ رُبع صدی کے اردو ادب کا مختصر جائزہ پیش کروں۔ بطریقِ امتثالِ امر ذیل کے چند صفحے افکار کے ناظرینِ کرام کی نذر ہیں۔

اگر اس رُبع صدی کا شمار بقیدِ ماہ و سال کیا جائے تو دوسری جنگِ عظیم کا آخری زمانہ بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور در اصل یہی اندازِ کار صحیح ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ سے معاشی اور معاشرتی بے کلی کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو اب تک ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس دور نے کئی رنگ بدلے۔ لیکن فرد اور معاشرے کا ربطِ باہم بے اطمینانی کی بنیادوں پر بدستور قایم رہا۔ جہاں ہم آج کھڑے ہیں۔ اس مقام سے نظر دوڑایئے تو پہلی عالمی جنگ کے بعد دوسری جنگ کے آغاز تک کے بیس برس اردو شعر و ادب کے لیے حیرت انگیز طور پر سیر حاصل ثابت ہوئے۔ "حیرت انگیز" اس لیے کہ یہی عرصہ برطانوی سامراج کے خلاف پورے برِ عظیم کی مسلسل جدوجہد کا زمانہ تھا۔ پھر بھی فرد اور معاشرہ، دل جمعی اور ہم جہتی کی ایک ایسی کیفیت سے بہرہ مند رہے۔ جس نے ادبی تخلیق کے لیے نئی نئی راہیں کھولیں۔ اور زندگی کے دھارے کو ایک نئے رخ پر موڑا۔ اردو نظم اور غزل کو اور ان سے زیادہ اردو گیت کو ایک نیا گداز اور ترنم نصیب ہوا۔ مارکس کے خیالات اور تاریخ کی تعبیر بر بنائے مادیت نے ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور ہم ایک جان دار شعری مسلک، ایک تیز چبھتے ہوئے افسانے اور پہلی مرتبہ، تنقید میں اقتصاد کی آمیزش سے آشنا ہوئے۔ نثر میں ایک نئے لہجے اور مزاح میں ایک نئی لطافت کا ظہور ہوا۔ ڈراما وجودی اور رومانی دونوں سطحوں پر جگمگا اٹھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اقبال نے اردو میں اپنے بہترین و بلند ترین کارنامے سرانجام دیے۔

دوسری جنگ عالمگیر کے خاتمے سے لے کر اب تک کی رُبع صدی میں ہماری فردِ عمل کچھ ایسی روشن معلوم نہیں ہوتی۔ کمی مقدار کی نہیں کیفیت کی ہے۔ سنہ ۱۹۳۹ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک کے چھ برس کچھ اس لحاظ سے ادبی تخلیق کو راس نہ آئے تھے کہ اقبال کے دورِ آخر کے نوجوان ادیبوں کی خاصی بڑی تعداد اپنے معمولاتِ زندگی کو چھوڑ کر جنگ کے متعلقہ کاروبار سے منسلک ہو گئی تھی۔ سنہ ۱۹۴۵ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک کے دو سال بھی اسی قسم کی افراتفری اور کشمکش کی بھینٹ

چڑھے۔ گویا ۱۹۳۹ء کے بعد سے آٹھ نو برس ایک ذہنی ابتلا کا دور بن کر آئے۔ دراصل ہم عصر ادب (رجحان دار ہم عصر ادب) پڑھے لکھے طبقے کی جذباتی و فکری زندگی کی بعض بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ جو ایک معتدبہ عرصہ تک اس قسم کی ذہنی تسلی سے محروم ہو جائے، صحت مند معاشرہ نہیں رہتا۔ چنانچہ اس عظیم روحانی خلا نے باطنی امراض کے جو بیج بوئے ان سے پیدا ہونے والی فصل ہم شاید ابھی تک پوری طرح کاٹ نہیں چکے۔

استقلالِ پاکستان کے ساتھ عزم و امید کے ایک خاص دور کا آغاز ہوا۔ جو امنگیں اور ولولے اب بیدار ہوئے انھیں ادبی تخلیق کی بھٹی سے کندن بن کر نکلنے کے لیے قرن ہا قرن نہیں تو بیس تیس برس ضرور درکار تھے۔ شروع شروع میں وہ جوشِ ایمان، جس کے شعلوں نے پاکستان کے رستوں سے خس و خاشاک کو صاف کیا تھا، شعر و ادب میں منعکس ہوئے بغیر نہ رہا ؎

برچھوں پہ چڑھائے ہوئے اجسام کے پرچم　　ہر سینے پہ دوشیزۂ معصومہ کا سر خم
اس جسم برہنہ پہ بھی ہر دخترِ آدم　　آتی ہے نظر اوڑھے ہوئے دامنِ مریم

خاموش نگاہوں کی حیا دیکھ رہے ہو
کاٹے ہوئے ہاتھوں کی دعا دیکھ رہے ہو

لیکن جس نظریاتی پس منظر کے بغیر نیا پاکستانی ادب ظہور میں آ ہی نہ سکتا تھا، اس سے ہماری اجتماعی (اور انفرادی) زندگی کی بے نیازی بہت جلد آشکار ہو گئی اور ان تلخ الفاظ کا موقع پیدا ہوا ؎

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں!

قیامِ پاکستان کے بعد کے سات آٹھ سال اور ان کی لائی ہوئی تخریبی اور تعمیری کاوشیں (جن کے اہم اجزا سازش، قتل، سیاسی جوڑ توڑ اور شہری آبادی کے خوفناک فسادات تھے) ادبی بے حاصلی کی ایک الگ داستان سناتے ہیں۔ یہ عرصہ پاکستانی ذہن کے پارہ پارہ ہونے کا دور ہے۔ نفسانیت اور تعصب نے نئی نئی گروہ بندیوں کی داغ بیل ڈالی اور پاکستان کے دل و دماغ کے حصے بخرے کر دیے۔

شیرازۂ ہستی کے یوں بکھرنے سے ہم ادبی اظہار و ابلاغ کے جس ویرانے میں آ پہنچے اس کا نقشہ صحیح طور پر سمجھنے کے لیے کسی ایسے دور کا تصور کیجیے جب ہم قوم اور ہم خیال ہونے کے درمیان کوئی خلیج حائل نہ تھی۔ اکبر اور اقبال کے عہد میں ایک متحدّ الاحساس اور ادبی طور پر فعال معاشرے کی موجودگی کا ثبوت اہلِ نظر کو ہر وقت ملتا تھا۔ اس معاشرے کو یک دل و یک زبان رکھنے والے اسباب (مثلاً کالے اور گورے کی کشمکش یا شیخ و برہمن کے نہ ختم ہونے والے ہنگامے) سیاست و معیشت میں شب و روز کارفرما تھے۔ اس زمانے میں فرنگی تہذیب کی فرومائیگی قومی شاعری کے مسلمات میں داخل تھی۔ احتسابِ نفس کے اس دور کے بعد جس کے علمبردار سید احمد خاں اور حالی تھے، اپنے تمدن اور قومی اخلاق کی خیالی برتری پر ہمارا ایمان ایک بار پھر مستحکم ہو گیا تھا۔ جب آزادی نصیب ہوئی تو اپنا تمدن اور قومی اخلاق جیسے کچھ بھی ہیں، واشگاف ہو کر سامنے آ گئے، اور اُن پر تکیہ کرنے کی کوئی صورت قایم نہ رہی۔ باقی رہ گئی فرنگی تہذیب،

سوائس پر پھبتی کی تحریک صرف انگریزوں کی موجودگی تک جان دار اور با معنی معلوم ہوتی تھی۔ انگریزی حکومت کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو تفریح پر ادبی طنز کا سارا لطف کرکرا ہو گیا۔ اب نہ اکبر و اقبال کی طرح مغربیت پر سیر حاصل طنز کرنے کا کوئی صحیح موقع نظر آتا تھا۔ نہ حالی کی طرح اپنی گذشتہ سیاسی عظمت کے ماتم کرنے کا کوئی جواز۔ دوسری طرف ہندو سرمایہ دار کے یک بیک غائب ہو جانے سے قوم کی نفسیاتی زندگی میں ایک اور عظیم خلا پیدا ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان نہ صرف مذہبی طور پر ایک الگ جماعت تھے، بلکہ سیاست و اقتصاد میں بھی اُن کی قومی ہستی اپنی مخصوص معاشرتی حدود رکھتی تھی۔ اور یہ حدود مسلمانوں کی جماعتی زندگی کے خد و خال مقرر کرکے انھیں ایک مستقل شخصیت عطا کرتے تھے۔ جونہی ہمارے روزمرہ معاملات میں ہندوؤں کا دخل نہ رہا۔ یا کم از کم شریک غالب کی حیثیت سے دخل نہ رہا، تو قومی ضمیر کو ایک بنانے والی یہ چیز بھی باقی نہ رہی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں قومی وحدت کا احساس چند روز کے لیے کچھ بیدار ہوا مگر تابہ کے؟ جو ایکا خارجی اسباب کے سہارے قایم ہو اور کسی اندرونی اخلاقی قوت کا استحکام اُسے نصیب نہ ہو وہ بہت دن زندہ نہیں رہ سکتا۔

۱۹۵۵ء کے بعد کے پندرہ برس کا عرصہ بھی، جو ہمیں اور ہمارے اس خیالی محاسبے کو زمانۂ حال تک لے آتا ہے اُمید کی جھلک سے خالی دکھائی دیتا ہے۔ اس دوران میں زبردستی کی تنظیم (معاشرتی، اقتصادی، ادبی تنظیم) کی بھی کوشش ہوئی۔ مگر ثابت ہوا تو یہی ہوا کہ تنظیم ٹھونسی نہیں جاتی، اندر سے اُبھرتی ہے۔ اسلام کا معاشرتی عدل (جس کا نام گذشتہ رُبع صدی میں اس کثرت سے لیا گیا کہ خود یہ لفظ اپنی اصل حقیقت کا پردہ بننے لگا) ابھی تک پاکستانی سوسائٹی میں تو کجا، خود پاکستانی ذہن میں بھی شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ گذشتہ سال سے ملک کے اندر ایک نظریاتی جنگ ضرور جاری ہے۔ جس سے کم از کم یہ ایک نتیجہ نکل چکا ہے۔ کہ پاکستان کے صاحبِ ضمیر طبقے نے اپنے دماغ کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ یہ سوال اب جلی حروف میں سامنے آ گیا ہے کہ وہ اسلامی نصب العین، جس کے حصول کے لیے پاکستان قایم ہوا، کیا ہے؟ اور دیکھنا یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد کی ناکامیوں سے ہم نے سبق سیکھا؟ کیا پاکستانی معاشرہ اب ایک ایسی سمت میں حرکت کر سکتا ہے جو اسے اسلامی حرّیت اور اسلامی اخوت و مساوات کی منزلِ مقصود تک لے جائے؟ یہ سوال ہم کو دراصل ایک انقلابی صورتِ حال کے تصور تک لے آتا ہے مگر یہ انقلاب پیدا کیے بغیر ہمیں کوئی ایسا مشترک نظریۂ حیات میسّر نہیں ہو سکتا جو ہمارے لیے قومی وحدتِ شعور کی بنیاد ہے۔

فی الحال کیفیت یہ ہے کہ ہمارا ادب، ہمارا ادیب اور ہمارا معاشرہ ہر رنگ اور ہر عقیدے کے متحارب فرقوں کی کشاکش کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے۔ ملائیت سے الحاد تک اور سرمایہ داری سے اشتمالیت تک ہر قسم کی عمرانی تحریک زبانوں میں نہیں تو دلوں میں اظہار کے لیے مچل رہی ہے۔ نئے دور کے میر و غالب اور حالی و اقبال جہاں کہیں ہیں اور جس حال میں بھی ہیں، کسی ہم ذوق و یک رنگ معاشرے سے مخاطب ہونے کے لیے اپنی مضطرب آنکھیں کھولے بے بسی کے عالم میں ٹکٹکی لگائے پڑے ہیں۔ بایں ہمہ اس وقت کم از کم اتنا ظاہر ہے کہ پاکستانی قوم تاریخ کے اس موڑ پر آ پہنچی ہے جہاں تعمیر کی کوئی نہ کوئی نئی صورت ناگزیر ہو گئی ہے۔ آزادی کے بعد ہم نے ادیب کو کسی نہ کسی نئے مقام شرف پر فائز کیا ہے۔ نہ کچھ نئے معاشرتی فرائض اُسے سونپے ہیں۔ اُس کی عزلت گزینی نے اُسے بارہا داخلی، تجریدی اور منفی (بلکہ کبھی کبھی تخریبی) طریقِ اظہار پر مجبور کیا ہے۔ وہ آج بھی اُس بے باک بھرپور اور مطمئن لہجے کی تلاش میں ہے، جو نکتہ سنج اور قدر شناس قارئین کے اشتراکِ فکر و احساس سے تخلیق کے عمل کو غیب کی آواز دیتا ہے۔

(مطبوعہ افکار۔ جوبلی نمبر۔ جون۔ جولائی ۱۹۷۰ء)

فاضل زیدی

تاریخ ہائے وفات

پروفیسر حمید احمد خاں

بخدا تھے خلوص کے پیکر
فیض گستر حمید احمد خاں
اُن کی تاریخ مرگِ نیک صفت
۶۵۰
پروفیسر حمید احمد خاں

۱۹۷۴ = ۱۳۲۴

طاہر شادانی

"موت عالم کی حقیقت میں ہے مرگِ عالم"
شاہد اس قول پہ ہے مرگِ حمید احمد خاں
اُس کی رحلت سے ہوئی علم کی محفل سُونی
آہ وہ مردِ خود آگاہ، وہ فخرِ دوراں
اُس کی فرقت میں وفا صبح و مسا روتی ہے
اہلِ دل اس کی جُدائی میں ہیں خونناب فشاں
"اک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی"
مٹ گیا عظمتِ اسلاف کا اک اور نشاں
طاہر اُس کے سن رحلت پہ کہو کھینچ کے "آہ"
۶
"رہروِ جنتِ فردوس حمید احمد خاں"

۱۹۸۰ — ۶ = ۱۹۷۴

عبدالعزیز خالد

رونق لاہور

سینہ پُرزخم، زخمہا ناسُور
ضبطِ گریہ ہے سعیِ نا مشکور

کون رونے سے روکتا ہے تجھے؟
عینُ! جُودِی بدُمعِکِ المُنزُور

یا صبا حاکَ! یا صبا حاکَ!
آ رہی ہے ندائے ویل وثبُور

آدمی — قادرِ علَیَ الاُطلاق
آدمی — بے ثبات و بے مقدور

زندگی کو دکھائے شانِ کئی
موت کے سامنے مگر مجبور

بنی آدم مُتا فرانِ عدم
جانے کس بات کا ہے ان کو غرور

ایک ٹھوکر لگے تو چھَن سے ہو
ان کی دُکانِ شیشہ چکنا چُور

اک خرابہ ہے آرزو کا نگر
خانہ ویرانیوں کا کیا مذکور!

گرد آلود ہے فضا دل کی
مجلسِ غم بنی ہے محفلِ سُور

منقلب ہے مزاج موسم کا
بوئے گُل ہے کہ موجۂ کافُور؟

کون رخصت ہوا گلستاں سے؟
کس کو روتا ہے بلبلِ مہجُور؟

کون عیسیٰ نفس بہ جنبشِ لب
کر گیا گُل چراغِ بزمِ سرُور

کس کے تن پر ہے طیلسانِ سفر؟
کون کرتا ہے سرحدوں کو عبور؟

رنگ کیوں آسماں کا ماند ہوا؟
کون زیرِ زمیں ہوا مستور؟

زرد ہیں کس کے سوگ میں پتّے؟
نو عروسِ بہار ہے رنجور؟

کاہنانِ طلسمِ لوح و قلم
جسے سمجھیں زباں شناسِ زبُور

سالکانِ مراحلِ معنی
جسے لکھیں نگار بندِ سُطوُر

زہد پیشہ مُعلّمِ پرُ فن
تھا جو اصلاحِ حال پر مامور

رُکنِ والرّاسِخُونَ فِی العِلمِ
لکھنا پڑھنا ہی جس کا تھا دستور

درس و تدریس میں مثال اپنی
تھا جو تشریحِ شعر میں مشہور

علم کے نور سے منوّر دل
شبِ دیجور میں تجلّیٔ طُور

تھے اناث و ذکور و پیر و جواں
جس کے سحرِ خطاب سے مسحُور

اس کے ہوتے عروسِ دانش کی
مانگ میں تھا سُہاگ کا سیندُور

آخری وقت تک لُٹا تا رہا
دونوں ہاتھوں سے جو دُرِ منثور

جیت کی بجے نہ ہار کی چنتا
تھا جو خود دار پر نہ تھا مغرور

وضعداری کے رنگ روپ کے ساتھ
مۓ اثباتِ ذات سے مخمور

ہم نے دیکھا کبھی نہ اَحیاناً
اس کے چہرے پہ سرخوشی کا وفور

وہ تو سنجیدگی کا پیکر تھا
بے ریا، با اصول، سادہ غیُور

انقلابات کا مزاج شناس
واقفِ گردشِ سنین و شہُور

امتزاجِ توکّل و تمکیں
راحت و رنج میں صبُور و شکُور

غم کی تاریک و تار راہوں میں
تھی رفیق اس کی ہمّتِ موفُور

تھا میانہ روی شعار اس کا
عُجلت و اشتعال سے تھا نفور

اک ادارہ تھا اپنی ذات سے وہ
داعی و ساعیِ فروغِ شعور

بات حُبِّ وطن کی جب بھی چلے
آۓ گا اس کا ذکرِ خیر ضرور

اس کا ایماں محبتِ اُردو
جس کا ہوتا طرح طرح سے ظہور

کاوِ کاوِ قلم یہ کہتی ہے
ہے ہنرور بھی بندۂ مزدور

نذرِ جاں دے کے اہلِ فکر و نظر
کریں زندہ روایتِ منصور

اک قیامت تھا آخری دیدار
جوش پر تھی طبیعتِ محزُور

آنسوؤں سے لدی ہوئی پلکیں
جیسے برسات کی گھٹا گھنگھور

تَدْمَعُ الْعُیُنُ، یَحْزَنُ الْقَلْبُ
ہم ہیں اِخفاۓ حال سے مَعْذور

کان آوازِ دوست کو ترسیں
اب جگاۓ گا اس کو نفخۂ صُور

زندگی خواب، موت بیداری
صادق آۓ مثالِ سایہ و نور

ہے عیاں رازِ زندگی ان پر
زندوں سے زندہ تر ہیں اہلِ قبُور

خرمنِ سوختہ سے رزق اُگے
شبِ یلدا سے پھُوٹے صبحِ نُشور

جانے والا گیا مگر خالد
لے گیا ساتھ رونقِ لاہور

ہو خدا اس کا حافظ و ناصر
رہ اندھیری ہے اور منزل دُور!

○

عظیم قریشی

عبقری کی موت!

(برّ عظیم کے ممتاز ماہرِ تعلیم، دانشورِ قوم و ملت، یگانۂ روزگار محقق و ادیب
پروفیسر حمید احمد خان کی بے وقت اور اچانک موت سے متاثر ہو کر!)

ایک شعلہ بُجھا
بجھ کے یہ کہہ گیا

خبر کا شبستاں فقط موت ہے
خودی کی نگہباں فقط موت ہے

ایک نغمہ مٹا
مٹ کے یہ کہہ گیا

ہوئی موت مومن پہ یکسر حرام
نبیؐ نے کہا جن پہ لاکھوں سلام

ایک تارا گرا
گر کے یہ کہہ گیا

خدا کا بھی میہماں بنا ہے حمیدؔ
محمدؐ کا درباں بنا ہے حمیدؔ

غلام رسول ازہر

بیاد حمید احمد خاں

وہ خودی کا نقیب، مردِ فقیر
وہ جنوں خیزیوں میں سیلِ رواں
عمر بھر جس نے علم کے سوتے
تھا جو پُرسوز آتشِ جاں سے
جس کا لاریب، ازہرِ خستہ،
نازشِ رنگ و رامشِ گلشن
جس سے گھر گھر یہاں اُجالا تھا
وہ جو مہر و وفا کا محور تھا
جس کے اخلاق کا جواب نہ تھا
فقر میں جس نے یاں امیری کی
ایک درویش بے گلیم تھا وہ
ضربِ شیشہ سے سینہ کاری کی
دُکھ کہیں ہو، تڑپ سا جاتا تھا
جس کے الطاف یادگاری ہیں
فیض کا ایک چشمۂ حیواں
بزمِ ہستی میں ہر عمل جس کا
اپنی سیرت کو جس نے ڈھالا تھا
نورِ محبوبِ حق پہ یاں ازہر
ہم فقیروں کا جو سہارا تھا
مومنانہ صفات رکھتا تھا

جذب سے جس کے مہر و ماہ اسیر
علم کا ایک بحرِ بے پایاں
شاخ در شاخ پھوٹتے ہی رہے
تھا جو خونبار، آرہ سوزاں سے
عشق کی آگ سے خمیر اُٹھا
شعلۂ عشق، دم بدم روشن
علم و عرفاں کا بول بالا تھا
وہ جو صدق و صفا کا مظہر تھا
جس کی نیکی کا کچھ حساب نہ تھا
ایک عالم کی دستگیری کی
بے عصا تھا مگر کلیم تھا وہ
کاہشِ جاں سے آبیاری کی
ساری دنیا کا غم جو کھاتا تھا
جس کے "قصے" زباں پہ جاری ہیں
جس سے سیراب ان گنت انساں
گویا حسنِ عمل کا آئینہ
اپنے قلب و نظر کو پالا تھا
بس گیا دل میں بے گماں ازہر
جس نے ہم سب کو یاں سنوارا تھا
بے ریا، "سچی" بات کرتا تھا

حق و انصاف جس کا ایماں تھا
جس کا دل تھا زباں کا سرمایا
جس کے دل سے زباں کی یاری تھی
عمر بھر جس نے حق بیانی کی
ہر نفس جو خودی کا حافظ تھا
علم پرور، عمل کا پیکر تھا
بامِ انسانیت کا زینہ تھا
جس کو انسان کی تلاش رہی
جستجو میں رواں دواں پیہم
وہ شب و روز کا مسافر تھا
اپنی منزل سے بہرہ ور تھا وہ
وہ معلم کہ کیمیا گر تھا
جس کے چھونے سے زندگی پہنے
حافظِ حُرمتِ قلم تھا وہ
پاک بیں، پاک نفس، پاک ضمیر
روبرو اس کے بے نقاب سی تھی
خوش نفس ایسا مردِ سیرت ساز
لیلیِٰ شوق سے وفایوں کی
محرم ذات تھا، قلندر تھا،
ایک مجذوبِ عشق پیشہ تھا
سالک راہ و رسمِ راز و نیاز
مہرِ نوروز تھا، مہرِ تاباں
جز خدا کس سے خوف کھاتا تھا
اصل میں دُرِّ ناب تھا ازہر
روحِ غالب سے فیضیاب تھا وہ

تھا یہ مضراب پردۂ جاں کا
نہ کبھی اُن میں فاصلہ پایا
اس لیے بات اُس کی پیاری تھی
جس نے اس طور زندگانی کی
دیدہ و دل کا جو محافظ تھا
جو فقط خوبیوں کا مظہر تھا
جس کو جینے کا یاں قرینہ تھا
آرزو اُس کی، جی کے پاس رہی
شہسوارِ زماں، مکاں پیہم
گامزن راہِ عشق پر تنہا
ایک انسان دیدہ ور تھا وہ
ایک انسان گر، نواگر تھا
نور افروز، کندنی گہنے
ایک درویشِ خوش رقم تھا وہ
جس کے حلقہ میں کائنات اسیر
زندگی اک کھلی کتاب سی تھی
زندگی جس کو آپ دے آواز
راہ میں اُس کی جان تک تج دی
ہفت اقلیم کا سکندر تھا
جو تہور میں شیر بیشہ تھا
ظلمتِ شب میں مونس و دم ساز
مردِ کامل، حمید احمد خاں
اس کو دبنا کبھی نہ آتا تھا
مردِ مومن کا خواب تھا ازہر
فکرِ اقبال کا جواب تھا وہ

اُڑ گیا آخرش مرا شہباز
کر گیا سوئے آسماں پرواز

○

طاہر شادانی

آہ! پروفیسر حمید احمد خاں

پھر آج شہرِ تمنا پہ غم کی یورش ہے — اُٹھا ہے بزمِ وطن سے یہ کون فخرِ زماں
یہ آج کون ہوا رہ سپارِ ملکِ عدم — فغاں بہ لب ہے فضا، کائنات گریہ کناں

یہ کس کی موت نے چھینا دل و نظر کا سکوں — ہر آنکھ روتی ہے، ہر دل ہے سوگوار یہاں
نہ جانے خون ہوا کتنی آرزوؤں کا — اٹھے ہیں آہ! جہاں سے حمید احمد خاں

بپا ہے محشرِ شیون فضائے گلشن میں — کہ آج "شیوۂ اہلِ نظر" کا ماتم ہے
جو کانِ فضل و ہنر کا تھا گوہرِ یکتا — وطن میں آج اک ایسے بشر کا ماتم ہے

عروسِ علم کا اُس نے سہاگ لوٹا ہے — جفا طرازیٔ چرخِ ستم شعار نہ پوچھ
رُکے گا کیسے یہ طوفاں سرشکِ خونیں کا — تھمے گی کب، مرے اشکوں کی جوئبار نہ پوچھ

لنڈھائے بادۂ عرفاں کے جام جس نے سدا — وہ میر میکدۂ فکر و فن کہاں ہے آج
وہ تھا جو مشرق و مغرب کا امتزاجِ حسیں — وہ اپنی ذات میں اک انجمن کہاں ہے آج

وہ جس کی ذات تھی اک موجۂ نسیم بہار — کھلائے حکمت و دانش کے پھول جس نے سدا
وہ علم و فضل کا تھا ایک ابرِ گوہر بار — دلوں پہ نقش رہے گا ہمیشہ نام اُس کا

جو پاسباں تھا زبان و قلم کی عصمت کا
وہ تھا جو عظمتِ اخلاق کا حسیں پیکر
کبھی جھکی نہ سیاست کے در پہ جس کی جبیں
چلا گیا ہے دریغا، وہ آج زیرِ زمیں

وہ جانِ صدق و صفا، منبعِ خلوص و وفا
وہ ایک صاحبِ ایماں، عظیم دانشور
وقارِ اہلِ نظر، آبروئے دیدہ وراں
خزینہ حکمت و دانش کا عبقریٔ زماں

وہ ایک پیکرِ رعنا تھا وضعداری کا
ادا شناسِ مروّت تھی جس کی خوئے کرم
یہاں ابھی ہیں بہت صاحبانِ فضل و کمال
ادیبِ نکتہ ور و اہلِ نقد ہیں لاکھوں
وفورِ سوزِ محبت سے تھا جو شعلہ بجاں
تھا جس کے سینے میں انسانیت کا دردِ نہاں
ہزار گلشنِ حکمت کے ہیں گلِ خنداں
مگر نہیں کوئی ان میں حمید احمد خاں

چلو ندیم! کہ اس بارگاہِ عظمت میں
لحد پہ اُس کی، عقیدت کے پھول لے کے چلیں
خلوصِ قلب و نظر کا خراج پیش کریں
جو پیش کر نہ سکے کل، وہ آج پیش کریں

سلام پہنچے، مرے دیدہ ہائے تر کا اُسے
سلام اس پہ مرے جذبۂ محبّت کا
سلام اُس پہ، مری آہِ نیم شب کا سلام
سلام اُس پہ مرے شوقِ جاں بلب کا سلام

دعا ہے طاہرِ ناشاد کی خدا کے حضور
ملاءِ اعلیٰ میں پائے وہ اک مقامِ حسیں
جوارِ رحمتِ حق میں اُسے ملے مامن
ہو اس کی روح کا مسکن بہارِ خلدِ بریں

سیف نیاز

پروفیسر حمید احمد خاں

آج اُن کی موت پر ہیں سیکڑوں دل داغ داغ
روشنی جن کی جہاں میں زندۂ جاوید ہے
عظمتیں تقسیم جو کرتے رہے اتنے عظیم
زندگی بھر خدمتِ انسان ہیں کرتے رہے
اپنے طلبہ کو سکھاتے تھے تمیزِ دل نشیں
جن کے دل میں احترام قائدِ اعظم بھی تھا
جن کی محفل میں نظامی، راشد و تاثیر کے
آج وہ اجڑا نہیں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا
آج وہ بھی الاماں! یادوں کی زینت ہو گئے

زندگی کو روشنی دیتا رہا جن کا دماغ
موت کی آندھی نے ایسے بھی بجھائے ہیں چراغ
جو نئے آفاق ہستی کا لگاتے تھے سُراغ
اک مئے تنویر سے لبریز ہستی کا ایاغ
جرأتِ شاہیں ہے کیا! کیا ہے یہاں مکّار زاغ
جن کی محفل میں جلے اقبال و غالب کے چراغ
ظلمتِ ادراک میں روشن تھے جدّت کے چراغ
اس صدی میں لہلہا یا تھا ثمر آور جو باغ
جن کے دم سے تھے شگفتہ زندگی کے باغ و راغ

ہے دعا اُن کی لحد پر رحمتیں نازل رہیں
جنّت الفردوس کی سب نعمتیں حاصل رہیں

○

ڈاکٹر سید عبداللہ

حمید احمد خاں۔ ذوق و شوق کا پیکر

حمید احمد خاں ذوق و شوق کے پیکر تھے۔ اردو تحریک کے سلسلے میں میرا اُن کا طویل رابطہ رہا۔ لیکن وہ صرف مجاہد اردو نہ تھے، ایک بلند پایہ ادیب، مشفق مگر ضابطہ پسند استاد اور نامور محقق بھی تھے۔

اس مختصر تحریر میں ان کے علمی و ادبی کاموں کی تفصیل مشکل ہے میں صرف یہ بتانا چاہوں گا کہ خود میں نے حمید احمد خاں سے کیا سیکھا، ان سے کیا پایا؟ اس موضوع پر طویل تحریر لکھی جا سکتی ہے۔ لیکن میں اس موقع پر، صرف چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

یہ معلوم ہے کہ اکتسابات کی کہانی بڑی دلچسپ اور نتیجہ خیز ہوتی ہے...... انسان اپنی زندگی میں بے شمار سرچشموں سے سیراب و فیض یاب ہوتا ہے، ان میں سے بعض اثرات تعمیری بھی ہوں تو گریز پا ہوتے ہیں، مگر بعض ایسے ہوتے ہیں جو دیر پا اور مستقل ہوتے ہیں اور اکتساب کرنے والے کے ان خیالات و تصورات کا ناگزیر جز بن جاتے ہیں جنھیں وہ حاصلِ عمر سمجھ کر ان پر اپنی شخصیت کی مہر لگاتا ہے۔

ہر دوسرے شخص کی طرح میرے اکتساب و استفادہ کی بھی ایک روداد ہے، جس میں درجنوں مشاہیر و اکابر ادب کے افادات شامل ہیں۔

اس مختصر تذکرے میں پروفیسر حمید احمد خاں کو جن عطیات کا میں ذکر کر رہا ہوں انھیں میں مستقل اور دیر پا فیوض کے زمرے میں رکھتا ہوں۔ اس سلسلے میں دو تین مثالیں دے رہا ہوں۔

میں جس زمانے میں اردو غزل پر درس دیا کرتا تھا۔ مجھے صنفِ غزل کے معقول فنی تجزیے کی جستجو ہوئی۔ کلیم الدین احمد غزل کو نیم وحشی صنف ادب کہہ چکے تھے۔ اور یوسف حسین خان کی روحِ غزل اور ڈاکٹر عبادت کی کتاب ابھی منظر عام پر نہ آئی تھی۔ غزل کے متعلق ہمارے تنقیدی ادب کا عام فیصلہ یہی تھا کہ یہ ایک بیکار صنف ہے... اور مولانا حالی کے تتبع میں غزل کی جمالیاتی معنویت سے زیادہ اس کی اجتماعی و اخلاقی افادیت پر زور دیا جاتا تھا..... نظم بڑی گھن گرج کے ساتھ آ چکی تھی اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اب غزل کا دم واپسیں ہے، کیونکہ اس استغاثے میں غزل کا وکیل صفائی کوئی نہ تھا۔

غزل کی اس مخالفت بلکہ اس کے خلاف شدید تعصب کے زمانے میں مجھے غزل پر ایک ایسا مضمون مل گیا جس میں جمالیاتی اصولوں اور ادب کے معقول معیاروں کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ یہ صنف نہ صرف یہ کہ اپنا جواز رکھتی ہے، بلکہ

ایک مخصوص تہذیب کی نمائندگی بھی کرتی ہے جس کی پردہ دار فضا نے اسے رمز و ایما کا لباس عطا کیا ہے اور جس کی علامتوں نے اسے وضع داری اور تمکین کی قبا پہنا رکھی ہے .... یہ مضمون حمید احمد خاں کا تھا۔ میں اس سے چند سال قبل ہمایوں میں محمد حسین ادیب کا ایک محققانہ مضمون اردو شاعری میں عشق و محبت کے مضامین کے بارے میں پڑھ چکا تھا اس سے بھی متاثر ہوا تھا، مگر اس کی حد اثر صرف یہ تھی کہ اس سے صرف مولانا حالی کے خیالات کی تردید ہوتی تھی، اس سے زیادہ اس میں کچھ نہ تھا۔ ان حالات میں غزل کے لیے مثبت انداز میں جس شخص نے پہلی مرتبہ مقدمہ لڑا وہ حمید احمد خاں تھا۔

اس مضمون کے بعد یوسف حسین خاں، محمد حسن عسکری، مجنوں گورکھپوری اسلوب احمد انصاری، عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابواللیث، سید عابد علی عابد سب نے اچھے اچھے مضمون لکھے .... لیکن حمید احمد خاں کے مضمون کا جو نقش بیٹھ چکا تھا اس پر کوئی اور نقش جم نہ سکا۔

سب کو معلوم ہے کہ مطالعۂ غالب، حمید احمد خاں کا شوق خاص تھا ..... انھوں نے دیوان غالب کا نسخۂ حمیدیہ بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے دوبارہ مرتب کر کے چھپوایا۔ غالب پر متعدد مضامین محققانہ و ناقدانہ لکھے۔ اور اب یہ سب غالبیات کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان مضامین میں، میں نے جس مضمون سے گہرا اثر قبول کیا وہ تھا غالب کا تصور حسن و عشق۔ اس تنقیدی مضمون کے مطالعہ سے مجھ پر مطالعہ غالب کی بہت سی راہیں کھلیں .... اور اب جب کہ "غالبیات" خود ایک وسیع علم اور فن ہے اور سیکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں اور مقالے اس موضوع پر منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں بہت سے خاص الخاص ہیں یہ حقیقت ہے کہ حمید احمد خاں کا مذکورہ بالا مضمون آج بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور میں اسے خاں صاحب کا عطیۂ خاص اور فیض وافر کا درجہ دیتا ہوں۔ میں ضرورت کے وقت آج بھی اسی مضمون کو دیکھتا ہوں۔

خاں صاحب کے میدان تحریر ایک سے زیادہ تھے اور میں پہلے بحیثیت طالب علم و مدرس اور بعد میں بحیثیت دوست ان کی ہر تحریر کو پڑھنے کا عادی تھا۔ مجھے ان کی انشائی تحریروں میں ان کے دو مضمون بہت اچھے لگے۔ ایک کا عنوان ہے "انگریزی معاشرت میں کتے کی حیثیت" اور دوسرا ہے۔ "بھارت یاترا" اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو کے انشائی ادب میں اس رتبے کے مضامین کچھ زیادہ نہ ملیں گے۔

حمید احمد خاں ایک خاص اسلوب بیان کے مالک تھے۔ ان کی تحریروں میں ضبط و نظم کے ساتھ ساتھ ایک ایسا حسن اور سلیقہ بھی نظر آتا ہے جو اردو فارسی کی ادبی روایتوں سے گہرے تعلق کا نتیجہ ہے ......، مگر جو چیز ان کی عبارتوں میں قاری کو خاص طور سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہے موزوں ترین لفظ کی تلاش .....، تحریر کی طرح ان کی تقریر میں بھی یہ خاص وصف تھا کہ وہ اپنے مطالب کے لیے مناسب ترین لفظ تلاش کیا کرتے تھے .....اور تحریروں میں تو ایسے گوہر کی جستجو میں وہ پہروں غواصی کرتے ...... اور جب تک یہ در نایاب حاصل نہ ہو جاتا اس وقت تک اپنی کاوش جاری رکھتے۔ خاں صاحب کی عبارتوں میں جھول، خلا اور سستی، بندش کبھی نہ آنے پاتی۔ ان کی نثر پلاسٹک آرٹ کے مانند حسن تکمیل کی معراج تھی۔

حمید احمد خاں کی تحریروں میں منطق اور معقولیت کا پلّہ بھاری رہتا تھا مگر خیال انگیز اضافتوں اور ترکیبوں کی چاشنی، ان میں نیم شگفتگی اور دلآویزی کی کیفیت پیدا کر دیتی تھی۔

ان کے اسی ایک فقرے کو دیکھیے : "تنقید ادب ایک جمہوری دنیا ہے جس میں اقلیدسی ہم آہنگی کی تلاش ایک فعل عبث ہے۔"

یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو:

"اردو میں مدح سے لے کر ہجو تک تغزل اور تفنن کی متعدد تدریجات بھی موجود ہیں۔ نفرت اور محبت کے قطبین کے درمیان شرارت کے خط استوا پر مزاح کا آفتاب چمکتا ہے ..... دیکھنا یہ ہے کہ اردو کی دنیا میں شرارت کا خط استوا کہاں واقع ہے اور اس پر مزاح کا آفتاب کتنی مرتبہ چمکا ہے ....."

حمید احمد خان ضمنی طور سے فلسفے کے بھی طالب العلم تھے اس اکتساب نے انھیں حکیمانہ تجزیے کا عادی بنا دیا تھا۔ ان کی کوئی تحریر ایسی نہ ملے گی جو منطقی تجزیے سے خالی ہو یا جس کی بنیادی معقولیت کمزور ہو۔۔ ان کے ادب کی طرح ان کی ذاتی زندگی میں بھی بہت کچھ تھا جو سیکھنے کے قابل تھا۔ مثلاً ان کی پابندیٔ وقت ایک قابلِ تقلید عادت تھی جسے میں نے اپنانا چاہا، لیکن اپنا نہ سکا۔ ایک نہایت عمدہ عادت خان صاحب کی یہ تھی کہ وہ دوسروں کے متعلق اپنے ناگوار ردِ عمل کو دل میں چھپا نہ سکتے تھے ...... فوراً ظاہر کر دیتے تھے، ان کے پاس بیٹھنے والوں کے لیے ان کی یہ عادت درحقیقت ایک نعمت تھی .... کیونکہ اس طرح تلافی کا موقعہ مل جاتا تھا۔

ہم لوگوں کے لیے خان صاحب کی صحبت و رفاقت ایک دبستان کا درجہ رکھتی تھی ......، میری طرح ان کے سب نیازمندوں نے اس مکتب سے بقدر ذوق و ظرف اکتساب فیض کیا مگر یہ ایک لمبی کہانی ہے جو طویل فرصت ہی میں بیان ہو سکتی ہے .....، فی الحال تو ان کی موت کے نیش تلخ سے ہمیں عہدہ برآ ہونا ہے ..... اور اس کے لیے بھی ایک عمر درکار ہے۔ مگر

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ تلخ

جب یہ ہو جائے گا تو شاید ہم میں سے کوئی حوصلہ مند، مقاماتِ حمیدی لکھ کر حق صحبت اہل گذشت بھی ادا کر دے گا۔

قمر ہاشمی کی عہد آفریں نظم
'دانائی کا آفتاب لینن'
جدید اردو شاعری کی آبرو ہے
اور عصر پیما ذہنوں کو فکر و تخلیق کے
سوتوں سے ہم آہنگ کرتی ہے
ٹریڈ انڈسٹری پبلیکیشن لمیٹیڈ
۱۴-ویسٹ وھارف روڈ، کراچی ۲

سید وقار عظیم

ارمغانِ حالی

(وضاحتی تبصرہ)

(حالی کی برسی کی تقریب میں پڑھا گیا)

شاعروں کے کلام کو اپنے ذوق اور پسند کے مطابق منتخب کرنے اور اس انتخاب کو سرمایۂ عزیز کی طرح محفوظ رکھنے کا مشغلہ مدتوں سے ہماری مجلسی اور تہذیبی زندگی کا بڑا محبوب مشغلہ ہے۔ کتب خانوں میں طرح طرح کی بیاضوں کی موجودگی اس تہذیبی رواج کی شاہدِ عادل ہے۔ بیاضوں سے قطع نظر تقریباً ڈھائی سو برس کی مدت میں لکھے جانے والے شاعروں کے تذکروں کی ایک مخصوص ترتیب اور ان میں منتخب اور پسندیدہ اشعار کو یکجا کرنے کی روش بھی اسی شوق کی ایک منظم صورت ہے، اس فرق کے ساتھ کہ بیاضوں کے انتخابات کا مقصد ذاتی ذوق کی تسکین ہے اور تذکروں میں آنے والے انتخاب اپنے جمالیاتی انبساط میں دوسروں کو شریک کرنے کی خواہش کا نتیجہ۔ لیکن دونوں طرح کے یہ انتخاب اس لحاظ سے یکساں اور مماثل ہیں کہ ان میں انتخاب کا معیار ذاتی پسند اور ذاتی ذوق ہی ہے۔ تذکروں میں اس طرح کے اشارے کہ کلام شاعر کی ذات کا عکس اور اس کے ماحول کا آئینہ ہے، شاذونادر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاعر کے کلام، اس کی ذات اور اس کے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول میں ربط پیدا کرنے کی شعوری کوششیں انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوئیں ــــ آبِ حیات اور یادگارِ غالب اس کی بڑی واضح اور نمایاں مثالیں ہیں۔

بیسویں صدی کے شروع میں کلام کے انتخاب کو شاعر کے مخصوص اسلوبِ خیال اور طرزِ بیان کا نمایندہ اور ترجمان بنانے کے رجحان کا آغاز ہوا اور انتخاب کے دامن کو اس حد تک وسیع کیا گیا کہ اس کے گھیر میں چیدہ چیدہ شعروں کی بجائے پوری پوری غزلوں کی گنجایش نکل سکے اور ذہین، فہیم اور خوش ذوق و صاحبِ امتیاز قاری کے لیے اس انتخاب کی مدد سے شاعر کے فکری میلانات کی تخمین اور اس کے فنی قامت کی تعین ممکن بن سکے۔ اردوئے معلّٰی میں شایع ہونے والے حسرت موہانی کے انتخابات اس امتیازی روش کے بڑے وقیع اور قابلِ قدر پیش رو ہیں۔ اس روش نے شعرا کے کلام کے انتخاب کو جو علمی رُخ دیا، وہ ہماری ادبی روایت کا مستقل رجحان بن گیا ہے اور متوسطین اور متاخرین میں سے شاید ہی کوئی غزل گو شاعر ہو جس کے کلام کا انتخاب کتابی صورت میں یا رسالوں کی خاص اشاعتوں اور تنقیدی اور تحقیقی مقالوں کے ضمیموں کی شکل میں مرتب اور شایع نہ ہو گیا ہو۔ متوسطین سے پہلے کے بعض اور متاخرین کے بعد کے شاعروں میں سے بہت سوں کے کلام بھی منتخب اور مرتب ہوئے ہیں۔ کتابوں

رسالوں اور مقالوں کی صورت میں مرتب اور شایع ہونے والے انتخابات میں سے اکثر میں معیار و مقدار اور کیف و کم کے فرق کے باوجود یہ بات موجود ہے کہ کلام کو کلیم کے ذاتی احوال اور اس کے عہد کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی صورت حال کے حوالے سے جانچا پرکھا گیا ہے۔

منتخب کلام کے متعلق میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس میں ذکر صرف غزل کے شعروں اور غزلوں کے انتخاب کا آیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ پچھلے ڈھائی سو برس میں غزل نے ہماری سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے ساتھ رفاقت کا حق جس استقامت اور وفاداری سے ادا کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی دوسری اصناف کے معاملے میں درست نہیں۔ اسی لیے ہم جب اپنی شاعری کا یا اس کے منتخب حصوں کا ذکر چھیڑتے ہیں تو وہ ذکر حقیقت میں غزل کا ذکر ہوتا ہے۔ دوسری اصناف نظم یا اصناف نثر کے انتخاب مرتب اور شایع کرنے کی روش ہمارے ادب میں رواج کبھی نہیں بنی، اور یہ تو شاید کسی نے سوچا ہی نہیں کہ کوئی شاعر اگر نثار بھی ہے، یا کوئی نثار اگر شاعر بھی ہے تو اسے اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ اس کے منتخبات کا مجموعہ مرتب ہو۔ یہ بات سب سے پہلے غالب کے سلسلے میں سوچی اور محسوس کی جانی چاہیے تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ غالب کے بعد کی ایک صدی کی ادبی تاریخ میں حالی کی منفرد اور یکہ و تنہا ذات ایسی ہے جن کی حیثیت فائقہ نثر اور نظم دونوں میں یکساں مسلّم ہے اور اس مسلّم حیثیت کا اعتراف بھی برابر ہوتا رہا ہے، لیکن نثر اور نظم کا ایسا انتخاب جو حالی کی عظیم الشان فکری اور تخیلی کاوش کا آئینہ ہو، مرتب کرنے کی سعادت حمید احمد خان صاحب کے حصے میں آئی اور انھوں نے "ارمغانِ حالی" اس کا نام رکھا۔

ارمغانِ حالی $\frac{22 \times 18}{8}$ کے مسطر پر چھپی ہے اور سرورق، تزئین اور فہرست کے صفحات شامل کرکے اس کی کل ضخامت ۳۱۷ صفحے ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں، مقدمہ اور انتخاب، اور انتخاب کا حصہ مزید دو حصوں میں تقسیم ہوا ہے، حصۂ نثر اور حصۂ نظم ۲۶۱ صفحے انتخاب کے ہیں اور ۵۴ صفحے مقدمے کے۔ اگر کسی نے دریا کو کوزے میں بند کر لینے والی بات کو محض تکلف یا شاعری کی بات سمجھ رکھا ہے تو اُسے کتاب کے ان دونوں حصوں کے ایک ایک لفظ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ حصۂ نثر میں حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی اور مقدمۂ شعر و شاعری کے علاوہ، متفرق موضوعات پر چھ مقالے، چار کتابوں پر تبصرے اور گیارہ خطوط، اور حصۂ نظم میں قدیم و جدید غزلیات، رباعیات اور ۱۵ قطعات کے علاوہ، چھوٹی بڑی ۱۶ نظموں کا انتخاب شامل ہے۔ مقدمے میں پانچ عنوانات کے تحت، حالی کی شخصیت اور کلام کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ پانچ عنوانات یہ ہیں: جوہر قابل اور معاشرہ، حالی کی شخصیت، شاعری، نثر اور حالات۔

"جوہر قابل اور معاشرہ" میں اس سوال کا مختصر اور جامع جواب دیا گیا ہے کہ جوہر خلاق کا ظہور کسی وہبی کمال کا نتیجہ ہوتا ہے یا صرف اکتساب کے عمل اور مقتضیاتِ عصر کا؟ — اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حالی کی ذات اور ان کے تخلیقی کارناموں کے متعلق بعض اہم باتیں کہی گئی ہیں، جو اتنی وضاحت کے ساتھ اور اتنے پُریقین اور پُر اعتماد انداز میں اس سے پہلے نہیں کہی گئیں، مثلاً یہ کہ:

(۱) ملّی و معاشی مقتضیات سے ان کے ذہن کا ہم آہنگ ہونا ان کی نظم و نثر دونوں میں چھلکا پڑتا ہے۔

(۲) جس طراوتِ تخیل کا ثبوت حالی کی شاعری کے بڑے حصے سے ملتا ہے۔ وہ وہبی کمال کے بغیر ممکن نہ تھا۔

(۳) اردو میں اصلیت پسندی کی تحریک (نیچرل شاعری) کے فروغ کا سب سے طاقتور منبع حالی کا اپنا ذاتی خلوص تھا۔

(۴) حالی نے اپنے "زندہ" جاوید قطعات میں نفسِ اجتماعی کے احتساب اور تنقیدِ معاشرہ کے عمل کو ایک نیا لہجہ دی

(۵) ۱۸۷۷ء سے ۱۸۹۲ء تک کی پانزدہ سالہ مدت، جو حالی کی شاعرانہ زندگی کے مرکز میں واقع ہے، ہماری قومی شاعری کے بہترین سال بھی ہیں اور حالی کے شعری اجتہاد کی معراج بھی۔

(۶) قدیم و جدید کے موازنے میں جو سنہرا اعتدال حالی نے قائم رکھا وہ کسی اور کے حصے میں نہ آیا۔

مندرجہ بالا بیانات میں سے ہر ایک ایسا ہے جسے عرفِ عام میں دعویٰ کہا جائے گا۔ حالی کی ذات اور ان کی ادبی تخلیقات کے متعلق اس طرح کے دعوے مقدمے کے مختلف حصوں میں چند نہیں بہت سے ہیں اور ہر دعوے میں یہی زور، یہی اعتماد اور یہی ادّعائی شان ہے، جو اوپر کی چند مثالوں ہیں۔

زندگی کے گوناگوں مسائل پر گفتگو کے دوران میں حسنِ ظن اور سوئے ظن کی مبالغہ آرائی، شخصیتوں کی جانچ پرکھ میں تحسین و تنقیص کا اشتداد، کارناموں کی تقدیر و تخمین میں اعتدال و توازن کا فقدان، حقائق کی تفہیم و تعبیر میں تفکر و تعقل کے بجائے جذبے کی دخل اندازی ایسی چیزیں ہیں جنھوں نے ہمارے پورے نظام استنباط کو غیر معتبر اور غیر یقینی بنا دیا ہے۔ ارمغان حالی کے مقدمے کا بڑا وصف یہی ہے کہ یہاں طبع سلیم نے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھایا اور حقایق کے بیان اور ان کی رشتہ بندی میں فلسفیانہ تجزیے اور منطقی استدلال کو اپنا رہنما بنایا ہے، اس لیے یہاں کوئی دعویٰ ایسا نہیں، جسے ٹھوس ثبوت کی پشت پناہی حاصل نہ ہو۔

حالی کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات برابر کہی جاتی رہی ہے کہ ان کے مزاج میں ایسی نرمی اور ایسا دھیما پن تھا کہ وہ لڑائی کے بغیر ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ ارمغان حالی کے مرتب نے اس رائے کو "حقائق سے چشم پوشی" کا نتیجہ قرار دیا ہے اور حالی کی زندگی کے چند واقعات بیان کر کے اور کلام حالی کی چند برمحل مثالیں پیش کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "ذاتی معاملات میں بے انتہا لحاظ و مروّت برتنے کے باوجود قومی معاملات میں حالی دو ٹوک بات کرتے تھے[۱]۔"

"یہ سچ ہے کہ ذاتی شائستگی کا معیار حالی نے اتنا بلند کیا کہ اپنے عہد میں اپنی نظیر آپ بن گئے، مگر اصول کی خاطر وہی کہنے اور کرنے میں جس کی گواہی ضمیر دیتا ہو، سیّد احمد خان سے قطع نظر، اس دور کا کوئی ادیب حالی کے مانند بے باک اور نڈر دکھائی نہیں دیتا[۲]۔"

مقدمے میں حالی کی زندگی، شخصیت اور کلام کے متعلق جا بجا جو حتمی اور حکمی دعوے کیے گئے ہیں ان سب کی بنیاد اسی طرح کے استقرائی استنباط پر رکھی گئی ہے، جس کا اظہار اوپر پیش کی ہوئی مثال سے ہوتا ہے۔ لیکن منطقی استنباط کا یہ عمل کسی ایک جگہ بھی فلسفیانہ تجزیے کو شریکِ سفر بنائے بغیر قدم نہیں اٹھاتا، اس لیے مقدمہ نگار جب حالی کی شخصیت کا

---

[۱] ارمغان حالی۔ صفحہ ۱۵۔

[۲] ارمغان حالی۔ صفحہ ۱۶۔

تجزیہ کرکے اس کے نقوش کو نمایاں کرلینے کے اہم فریضے سے فارغ ہوتا ہے تو اپنی توجہ حالی کے کلام کی طرف مبذول کرتا ہے کہ اس کے نزدیک کلام حقیقت میں کلیم کی ذات کا عکس اور اس کے اوصاف کا پرتو ہے۔ شاعری کے تجزیے کی داستان کا آغاز مقدمے میں اس سوال سے کیا گیا ہے:

"معاشرتی علائق کے جزئیات پر یہ توجہ، ہمدردی، ابنائے جنس کا یہ بے لوث تصور، پاکیزگی نفس پر یہ اصرار، حمایتِ حق میں یہ بے باکی، بلند مقاصد کی لگن اور ضمیر کا یہ خلوص جب شعر کی تپش میں جلا تو اس سے کیا کیمیا تیار ہوئی ہے[1]"

اس سوال کا جواب وہ بصیرت افروز بحث ہے جو حالی کی شعری تخلیقات اور نثری تصنیفات کے مختلف پہلوؤں پر مقدمے کے اگلے ۴۰ صفحوں میں کی گئی ہے۔ اس بحث کو بصیرت افروز میں نے محض رسماً نہیں، بلکہ اس احساس کی بنا پر کہا ہے کہ تنقید، تحقیق اور تجزیے کے ملے جلے عمل نے پہلی بار ہمیں حالی اور اس کے اجتہادات کی روح تک پہنچنے کا موقع دیا ہے اور پہلی مرتبہ ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ اس عظیم فکری اور فنی انقلاب کا تصور کرسکیں، جس کا صور حالی نے اپنی نثر و نظم کے ذریعے پھونکا تھا۔ حالی کے ان اجتہادات کی فہرست طویل ہے جو اس فکری اور فنی انقلاب کا پیش خیمہ بنے جن کا ذکر میں نے ابھی کیا۔ اب انھیں ایک ایک کرکے گن لیجیے:

(۱) نیچرل شاعری کا دور ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ حالی کی غزل میں واقعیت پسندی کا آغاز ہوا۔

بے قراری تھی اک امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازیِ شبِ ہجراں میں نہیں

یہی واقعیت پسندی مرثیوں میں بھی ابھر کر سامنے آئی ہے ؎

دیکھ لو آج، پھر نہ دیکھو گے
غالبؔ بے مثال کی صورت

نظموں میں "برکھارت" بھی اسی لحاظ سے ایک انقلاب آفریں نظم ہے۔

(۲) حالی کا دوسرا اجتہاد یہ ہے کہ انھوں نے نئے نئے خیالات کو نئی زبان میں پیش کرکے قومی شاعری کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کردیا۔ اس دعوے کی وضاحت کے لیے فاضل مقدمہ نگار نے تین شعر کے اس قطعے کا تجزیہ کیا ہے جو ترکیب بند موسومہ "مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ (مرقومہ ۱۸۸۰ء) کے بیچ میں ایک جگہ آیا ہے:-

؎

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کردیا

---

[1] مقدمہ ارمغان حالی - صفحہ ۳۲۔

تاکہ رھگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آسان گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا

مقدمہ نگار کی ژرف بینی نے ان تین شعروں میں حالی کے فکری میلانات کی جو جو جھلکیاں دیکھی ہیں ان کا جلوہ قاری کے قلب اور ذہن دونوں کو ایک نئی روشنی عطا کرتا ہے اور اسے پہلی مرتبہ اندازہ ہوتا ہے کہ حالی ادب و شعر میں کس دور رس انقلاب کے پیش رو ہیں۔ تجزیے کے الفاظ یہ ہیں:

"ان اشعار میں پہلے مصرعے کا پہلا لفظ (جھٹ پٹا) اپنی پوری قوت سے غزل کی زبان پر بیٹھ پھیرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پھر "مٹی کا دیا" زرق برق درباروں سے اپنی علٰحدگی کا اعلان کرتا ہے۔ اور یہ دیا بازار سے خرید کے نہیں "گھر سے لا کے" روشن کیا گیا ہے، جس سے عطا کنندہ کے ایثار و محبت کے ساتھ ساتھ اس کے محدود وسائل کا اظہار مقصود ہے۔ یہ عطا کنندہ کون ہے؟ محض "ایک بڑھیا"! (نہ کہ ایک خوبصورت شہزادی یا نوجوان شہزادہ) اس مصنوعی زندگی کی تصویر جو درباروں کے اندر اور جاگیرداروں کے گرد گھومتی تھی، اس بڑھیا کے مٹی کے دیے کی روشنی میں مدھم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مٹی کا دیا بڑھیا کے جھونپڑے کے اندر نہیں "سرِ راہ" روشن کر دیا گیا ہے، تاکہ کسی ایک شخص کے بجائے "ہر اک چھوٹا بڑا" اس سے فائدہ اٹھائے۔"

حالی کی شناخت اور دریافت کی جس مخلصانہ سعی کا سراغ ہمیں اس چھوٹے سے قطعے کے مختصر، جامع اور موثر تجزیے میں ملتا ہے، اس کا اظہار حالی پر لکھے جانے والے صدہا صفحات میں محض خال خال نظر آئے گا۔ قطعے کا یہ تجزیہ اور تبصرہ حالی کے دو اور اجتہادات کی نشان دہی کرتا ہے۔ انھیں میں حالی کے اجتہادات کی فہرست میں تیسرے اور چوتھے نمبر پر رکھ رہا ہوں۔

(۳) اس تجزیے کی رو سے حالی کا تیسرا اجتہاد یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کا رخ حسن و عشق اور رندی و آوارگی کے بازار سے موڑا اور اس چوراہے کی طرف کر دیا، جہاں سے روزمرہ زندگی گزرتی ہے۔

(۴) اور چوتھا اجتہاد جو ایک لحاظ سے تیسرے اجتہاد کا شاخسانہ ہے، اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ شعر کی زبان زندگی کی زبان سے الگ نہیں ہو سکتی اور نظم اور نثر کے لفظوں کے درمیان ذات پات کی کوئی تمیز نہیں۔

(۵) حالی بنیادی طور پر معلّمِ اخلاق تھے۔ اس حثییت سے حالی نے مستقبل کے ادیب اور شاعر کو اجتہاد کے دو راستے دکھائے:

(الف) ایک یہ کہ شاعر اور ادیب نفسِ اجتماعی کے احتساب اور تنقید معاشرہ کے عمل کو اپنا منصبی فریضہ سمجھ کر احتساب اور تنقید میں منطق کی متوازن روش اختیار کرے۔

(ب) اور دوسرے یہ کہ وہ خیال اور بیان دونوں کو یکساں اہم جان کر ان جملہ فنی وسائل سے کام لے جن کے بغیر فن کی رسائی درجۂ کمال تک نہیں ہوتی۔

مقدمہ نگار جس طرح حالی کی شخصیت کے صحیح نقش کو ابھار کر سامنے لاتا' اور فکر و ذکر اور خیال اور بیان میں ان کے اجتہادات کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس طرح اس نے حالی کی ادبی تخلیقات کے رتبے کے تعین میں بھی بڑی کاوش کی ہے اور مثالوں اور دلیلوں سے ان کے متعلق واضح اور حکمی فیصلے ہم تک پہنچائے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے :

(۱) مسدّس "مدوجزرِ اسلام" کے متعلق فاضل مقدمہ نگار کی رائے یہ ہے :

"اس نظم کی مجموعی درد مندی اور صداقت، اس کے موضوع کا عظیم الشان محیط، اس کی رنگ برنگ سیرت نگاری و تصویر کاری اور اس کا رقت انگیز اندازِ حکمت و موعظت اسے دنیا کی بڑی نظموں میں جگہ دیتا ہے[۱]"

(۲) "گزشتہ ایک سو برس میں نئے تنقیدی نظریات کا ظہور ہوا اور سیرت نگاری نے تغیرِ زمانہ کے ساتھ کئی پلٹے کھائے، بااین ہمہ مقدمہ شعر و شاعری اور یادگارِ غالب دونوں کا مقام اب بھی اسی طرح مستند اور مسلّم ہے جس طرح انیسویں صدی میں تھا[۲]"

(۳) "کتاب کے بین السطور کا تمدّنی محیط اور اس کے بیان کا اعتدال، متین لہجہ اور متوازن تبصرہ اسے دنیا کی بڑی سوانحی تصانیف میں جگہ دیتا ہے[۳]"

شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت، ان کی ادبی اور علمی خدمات اور ان کے انفرادی کارناموں کی علمی، ادبی اور فنی حیثیت پر اظہارِ رائے کے سلسلے میں ہماری تنقید میں ہمیشہ سے حد درجے کی افراط و تفریط کا اظہار ہوتا رہا ہے، کبھی محض سہل انگاری اور آسان پسندی کی بنا پر، کبھی پسند اور ناپسندیدگی کے ذاتی میلانات کی وجہ سے، کبھی تعقل و تفکر اور تجزیے اور دلیل کے بجائے محض جذبات کو چراغِ رہ گزر سمجھ لینے کی روش کے سبب، کبھی معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی معیاروں کو بلاکم و کاست قبول کر لینے کی عادت سے مجبور ہو کر اور اکثر و بیشتر غیر منصفانہ ناقدانہ ذمہ داری کے تقاضوں سے چشم پوشی کر کے، ناقدینِ ادب نے اس طرح کی آرا کا اظہار کیا ہے کہ نہ ادیب و شاعر کا صحیح چہرہ مہرہ ہمارے سامنے آیا اور نہ اس کی ادبی و شاعرانہ حیثیت کی صحیح شناخت اور تعین ممکن ہو سکی۔ مصحفی، غالب، مومن، ذوق، ناسخ، نظیر اکبر آبادی اسی طرح کے چند نام ہیں، جنھیں ہم نے صحیح معنوں میں اس وقت پہچانا ہے جب کسی جرأت مند نے ان کی وکالت کا بیڑا اٹھایا اور رسوم و قیود نے انھیں غلط فہمیوں کے جن دھندلکوں میں چھپایا تھا، وہاں سے باہر لا کر ان کے روئے زیبا کی اصلی جھلک ہمیں دکھائی۔۔۔۔ اسی طرح کی جرأت مندانہ وکالت کی ضرورت حالی کو بھی تھی' اور وہ وکیل انھیں مرنے کے ٹھیک ۵۶ سال بعد ملا[۴] ارمغانِ حالی کے مرتب نے وکالت کی یہ خدمت جس جوش، ولولے، اخلاص، دیانت اور ذمہ داری سے

---

[۱] مقدمہ ارمغان حالی ۔ صفحہ ۲۴

[۲] مقدمہ ارمغان حالی ۔ صفحہ ۳۰

[۳] مقدمہ ارمغان حالی ۔ صفحہ ۳۹

[۴] مقدمہ کے آخر میں تاریخ تحریر ۳۱ ردسمبر ۷۰ء درج ہے۔

انجام دی ہے اس کی مثال ہماری تنقید میں آسانی سے ملنی مشکل ہے۔ حالی کی شخصیت کی شناخت اور ان کے ادبی اور شاعرانہ مرتبے کے تعین میں ہم نے جو کوتاہی برتی تھی اس کا شدید احساس اس وکالت کا محرک بنا اور وکیل نے موکل کے فکری اور تخیئلی منابع تک رسائی حاصل کرنے اور اس کے محرکات شعری کا سراغ لگانے کی کوشش اور لگن کے ساتھ کام کی طرح ڈالی اور اچھی شاعری کو ذاتی کمال اور ماحول کے اثرات کا ملا جلا نتیجہ سمجھنے کی منطق کی رہنمائی میں حالی کی تخلیقات نثر و نظم کو احتساب کی کڑی منزلوں سے گزارا، جب کہیں جا کر مقدمے کے ان ۵۴ صفحات کی تخلیق ہوئی ہے جو حالی کی شخصیت کے پورے نقش کو ابھار کر ہمارے سامنے لائے اور ان کی ذات، ماحول اور کلام میں صحیح منطقی رشتہ قایم ہوا۔

مقدمے کے بعد حالی کی نثر و نظم کا وہ انتخاب ہے جس کا ذکر میں شروع ہی میں کر چکا ہوں۔ کسی ادیب یا کسی شاعر کے کلام کا انتخاب کتنا مشکل کام ہے، اور یہ کام اس صورت میں کیسے مشکل سے مشکل تر بن جاتا ہے جب ادیب شاعر اور شاعر ادیب بھی ہو، اس کا اندازہ صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب ہم کسی کا انتخاب کرنے بیٹھیں۔ کلام کو ایک دو مرتبہ نہیں بار بار پڑھ کے اور مختلف پہلوؤں سے اس پر سوچ بچار کر کے "اخذ و ترک" کے بے شمار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے جب کہیں ایسا انتخاب ممکن ہوتا ہے جو ادیب و شاعر کی ذات، اس کے ماحول، اس کے فکری اور تخیئلی میلانات اور اس کے فنی مسلک کی صحیح نشان دہی کر سکے۔ ارمغان حالی بلاشبہ ایسا ہی انتخاب ہے۔ انتخاب کے حصے میں اقتباسات کے شروع میں جو تشریحی نوٹ، اور متن میں جا بجا جو حواشی شامل ہیں ان سے اقتباسات کی معنویت اور زیادہ واضح ہوتی ہے۔

انتخاب کے کام میں منطق کا پورا اہتمام کیا گیا ہو پھر بھی ہم اسے ذاتی پسند کی چیز کہتے ہیں، سو یہ بات یہاں بھی درست ہے، لیکن ایک فرق اور ایک امتیاز کے ساتھ۔ انتخاب کے مختلف حصوں کا مطالعہ کرتے وقت ممکن ہے کبھی کبھی ہمارا جی یہ چاہے کہ اس میں فلاں چیز بھی شامل ہو جاتی تو اچھا تھا، لیکن یہ شاید ہم میں سے کوئی بھی نہ کہہ سکے کہ اس انتخاب میں سے یہ چیز نکال دی جائے، اس لیے کہ اس حسین انتخاب کی اجتماعی ترکیب ہی ہے جس کی مدد سے ہم ایک طرف تو حالی کی فکری روح کو پہچانتے اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو سنتے ہیں اور دوسری طرف اس سیاسی، معاشرتی، تہذیبی ماحول کی واضح جھلکیاں دیکھتے ہیں جس نے حالی کو حالی اور اس کی تخلیقات کو اس عہد کی روح کا حقیقی ترجمان بنایا ہے۔

بچوں کے مشہور شاعر سرور بجنوری کی نظموں کا مجموعہ

○ "اچھی نظمیں" ○

کے نام سے شایع ہو گیا

قیمت: ——— ایک روپیہ پچاس پیسے

ناشر۔ مکتبۂ اہلِ قلم ۲۵۵۔ کالی منڈی۔ ملتان

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

پروفیسر حمید احمد خاں اور مرزا غالب

پروفیسر حمید احمد خاں کا اس دنیا سے اچانک اٹھ جانا ایک عظیم انسان، ایک عظیم ادیب اور ملت کے ایک عظیم فرد کا اٹھ جانا ہے۔ ان کی ذات میں علم و دانش اور خلق و مروت کی ایسی اعلیٰ صفات مجتمع ہو گئی تھیں کہ اب اس ڈھب کا کوئی آدمی ہماری محفل میں نظر نہیں آتا۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ جب تک رہے اصول و صداقت کے لیے لڑتے رہے۔ زندگی کی کٹھن سے کٹھن اور پیچیدہ سے پیچیدہ راہوں میں کبھی نہ وہ کسی سے مرعوب ہوئے اور نہ کسی کو بے سبب مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ ہاں ان کی شرافت و بصیرت اور حسنِ اخلاق و حسنِ عمل کی حکمرانی، ہم سب کے دلوں پر تھی اور آج بھی ہے۔ ایسی حکمرانی جو دل نوازی و دل داری کے معنی سمجھاتی ہے۔ ادب، احترام کا سلیقہ سکھاتی ہے اور آدمی کو انسان بناتی ہے۔

ہلکا پھلکا چھریرا بدن، مختصر سا قد، بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کی مثال۔ رُواں رُواں متحرک و فعال۔ پیشانی پر ذہانت و فراست کی چاندنی۔ آواز میں صداقت کی گرمی اور خلوص کی چاشنی، شخصیت میں علم و اخلاص اور شفقت و مروت کی کشش۔ چھوٹوں کے ساتھ بزرگوں کی اور بڑوں کے ساتھ نیازمندوں کی روش۔ جس محفل میں ہوتے، خود پوشی کی کوشش کے باوجود سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے۔ ہر شخص انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا، اور اپنا رفیق و عزیز جانتا بالکل اسی طرح جیسے اللہ کے نزدیک طور کی چھوٹی سی پہاڑی سب سے افضل ہے۔

اقلِ جبال الارضِ طور و انہ
لاعظم عند اللہ قدرًا و منزلاً

خوش قسمتی سے راقم الحروف کو بھی پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم سے، شرفِ نیاز حاصل تھا، پچھلے چند برسوں میں تو ان سے کئی بار ملنے کا موقع ملا۔ بعض ملاقاتیں دن دن بھر کی تھیں اور کئی وجوہ سے میرے لیے فخر و مسرت کا سرمایہ بنیں، باہم مراسلات کا بھی سلسلہ رہا۔ خاص طور پر جس زمانے میں میری کتاب زیرِ طبع تھی[1] درجنوں خط اِدھر سے گئے اور درجنوں اُدھر سے آئے۔ اور میرے لیے ہمت افزائی اور لطف ارزانی کے تحفے لائے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس دن انتقال ہوا۔ اسی دن صبح

---

[1] "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" مطبوعہ مجلس ترقی اردو لاہور

میں نے انھیں ایک ذاتی نوعیت کا خط ڈالا تھا۔ خدا جانے یہ کس کے ہاتھ لگا۔ لیکن میں اس جگہ ملاقات و مراسلت کی حکایت سنانا پسند نہ کروں گا۔ اوّل اس لیے کہ اس میں قارئین کی دلچسپی کا زیادہ سامان نہ ہوگا۔ دوسرے اس لیے کہ میرے لیے یہ حکایت اتنی لذیذ و عزیز ہے کہ اگر میں اسے اختصار کے ساتھ بھی بیان کروں تو خاصی طویل ہوجانے کا خطرہ ہے۔ اس لیے اس جگہ پروفیسر حمید احمد خان کے بارے میں ذاتی ملاقات و مراسلات کے حوالے سے نہیں، بلکہ غالبؔ کے حوالے سے کچھ کہنے کی کوشش کروں گا، اس لیے کہ اول اوّل غالب ہی کی معرفت میں نے انھیں جانا پہچانا ہے، اور غالب ہی کی معرفت میرے دل میں ان کی ناقدانہ ژرف بینی اور عالمانہ صلاحیتوں کا احترام پیدا ہوا ہے۔

ہمارے ہاں غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا حقیقی احساس بیسویں صدی میں مولانا حالی کی یادگار غالب مطبوعہ ۱۸۹۷ء کے بعد ہوا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا مقالہ "محاسن کلام غالب" شایع ہوا اور بعض وجوہ سے اس کا شور علمی و ادبی فضا میں اتنا بلند ہوا کہ غالب کے طرف دار اور سخن فہم، دونوں غالب کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر یہ سلسلہ ایسا قایم ہوا کہ اب تک کسی نہ کسی طور پر جاری ہے۔ نہ لکھنے والے سیر ہوتے ہیں اور نہ پڑھنے والے۔ سیکڑوں کتابیں اور ہزاروں مقالے شایع ہوچکے ہیں۔ لیکن بیسویں صدی کے سارے ذخیرے میں جن بزرگوں کا کام ۱۹۵۰ء سے پہلے کا ہے اور انفرادی و اساسی اہمیت کا مالک ہے۔ ان میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری[1] مولانا غلام رسول مہر[2]، شیخ محمد اکرام[3] اور پروفیسر حمید احمد خان[4] کے نام آتے ہیں۔ مولانا مہر اور شیخ اکرام کے کام کی نوعیت بیشتر تحقیقی ہے۔ ڈاکٹر بجنوری اور پروفیسر حمید احمد خان نے تنقیدی نظر سے کلام غالب کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا مہر اور شیخ اکرام کے کاموں کی اہمیت کا چرچا عام ہوچکا ہے۔ لیکن پروفیسر حمید احمد خان کی غالب شناسی کی اہمیت و نوعیت سے ابھی تک لوگ کچھ زیادہ واقف نہیں ہیں۔ اس لیے مختصر اظہار خیال نامناسب نہ ہوگا۔

پروفیسر حمید احمد خان شعر و ادب کا فطری ذوق بھی رکھتے تھے، اور مغرب و مشرق دونوں ادب سے اچھی طرح واقف تھے۔ انگریزی اردو اور فارسی ادب پر ان کی نظر وسیع بھی تھی اور گہری بھی۔ ایسی صورت میں اپنے دورِ شباب میں، اگر ڈاکٹر بجنوری کی طرح، ان کی نظر بھی اردو شعرا میں سے صرف غالب، پر آکر ٹھہری، تو چنداں تعجب کی بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اُس جدید فکر و نظر کی روشنی میں جس کا آغاز و عروج ہمارے مغرب کے زیرِ اثر بیسویں صدی میں ہوا اور جس نے ایک ملک کے ادب کو، کم و بیش دنیا کے ہر ملک کا ادب بنا دیا ہے، اردو کے صرف دو شاعر ایسے ہیں جن کا کلام بیسویں صدی کے قاری کے لیے غیر معمولی کشش کا سامان رکھتا ہے۔ ایک غالب دوسرے اقبال۔ پروفیسر حمید احمد خان کو دونوں کی ذات و صفات سے لگاؤ تھا۔

---

1. مقدمہ نسخۂ حمیدیہ مطبوعہ گورنمنٹ پریس بھوپال طبع اول ۱۹۲۱ء
2. غالب نامہ از شیخ محمد اکرام مطبوعہ ۱۹۳۶ء
3. غالب از مولانا غلام رسول مہر مطبوعہ ۱۹۳۷ء
4. غالب کے کلام میں حسن و عشق مطبوعہ ہمایوں ۱۹۴۹ء

غالب سے پروفیسر حمید احمد خان کے لگاؤ کی داستان خاصی پرانی ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ

"اوائل سنِ شعور میں غالب کے کلام کے جس پہلو نے مجھے بہت متاثر کیا وہ مادی کائنات کی وسعتوں پر غالب کی ذہنی گرفت تھی۔

میرے نزدیک غالب کا یہ کمال حیرت انگیز ہے کہ گو میری زندگی نے کئی پلٹے کھائے مگر عمر کے کسی مرحلے میں بھی غالب نے میرا ساتھ نہ چھوڑا" [1]

غالب کا کلام، پروفیسر حمید احمد خان کے لیے ذوقِ طبع کی وقتی تسکین یا تفریحِ طبع کا ذریعہ نہیں رہا بلکہ انھوں نے پوری سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ غالب کی زندگی اور کلام کو اپنے مطالعے کے لیے انتخاب کیا ہے۔ اُن کا مطالعہ تحقیق و تنقید دونوں نقطۂ نظر سے غالب شناسی کے سلسلے میں حد درجہ اہم اور منفرد ہے۔

تحقیق کے سلسلے کا اُن کا اہم ترین کام نسخۂ حمیدیہ کی نئی ترتیب و تدوین اور تازہ اشاعت ہے [2]۔ نسخۂ حمیدیہ، غالب کا وہ مجموعۂ کلام ہے جس کا قلمی نسخہ مرقومہ ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء بھوپال میں دستیاب ہوا اور مفتی انوار الحق کے زیر اہتمام بعہد نواب حمید اللہ خاں ۱۹۲۱ء میں بھوپال سے شایع ہوا۔ اس میں چوبیس سال تک کی عمر کا تقریباً سارا کلام ہے اور غالب کا متداول دیوان اسی سے ماخوذ ہے۔ ہر چند کہ "نسخۂ حمیدیہ" کی اشاعت میں بڑی احتیاط و اہتمام سے کام لیا گیا۔ پھر بھی بعض باتیں اہلِ نظر کو کھٹکتی تھیں لیکن مطبوعہ اور قلمی نسخوں کے گہرے تقابلی مطالعے کے بغیر کچھ لکھنا بہت مشکل تھا۔ یہ کام وقت، محنت اور وقتِ نظر کے ساتھ ساتھ کلامِ غالب کا وسیع مطالعہ چاہتا تھا۔ شاید اسی لیے پروفیسر حمید احمد خان کے سوا کسی اور کو اسے ہاتھ لگانے کی ہمت نہ ہوئی۔

پروفیسر حمید احمد خان اسی کام کے لیے ۱۹۳۸ء میں بھوپال گئے اور کتب خانے میں بیٹھ کر نسخۂ حمیدیہ کے مطبوعہ و قلمی نسخے کی ایک ایک سطر کا تقابلی مطالعہ کیا۔ بعد کو اس مطالعے کے نتائج "نسخۂ حمیدیہ" اور غالب کے سلسلے میں نہایت اہم ثابت ہوئے۔ اگر پروفیسر حمید احمد خان ۱۹۳۸ء میں یہ کام نہ کر لیتے تو شاید نسخۂ حمیدیہ کو دوبارہ متنی صحت کے ساتھ شایع کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس لیے کہ کچھ دنوں بعد "نسخۂ حمیدیہ" (قلمی) بھوپال کی لائبریری سے غائب ہو گیا اور ابھی تک اس کا سراغ نہیں لگا۔ نسخۂ حمیدیہ (مطبوعہ) بھی کمیاب نہیں نایاب ہے۔ ایسی صورت میں نسخۂ حمیدیہ کی از سرِ نو ترتیب تدوین اور حد درجہ کارآمد حواشی و مقدمہ کے ساتھ اس کی اشاعت [2] اردو زبان و ادب اور غالب سے دلچسپی رکھنے والوں پر پروفیسر حمید احمد خان کا ایسا احسان ہے جسے ادب کی تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی۔

مفتی انوار الحق نے مطبوعہ نسخے کے دیباچے میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ قلمی نسخے کے حاشیوں پر جو اضافے اور متن کی اصلاحیں درج ہیں وہ ۱۲۴۸ھ میں لکھی گئی ہیں۔ حمید احمد خان نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ حاشیے کے اضافے اور اصلاحیں غالب کے سفرِ کلکتہ پر روانہ ہونے سے پہلے یعنی ۱۸۲۶ھ تک تصنیف ہو چکے تھے۔ قلمی نسخے پر چونکہ ۱۲۳۶ھ کی ایک مہر فوج دار محمد خاں کے نام سے ثبت تھی اس لیے مفتی صاحب نے یہ قیاس کیا تھا

---

1. "غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں" مطبوعہ مجلس یادگار غالب لاہور ۱۹۶۹ء
2. "نسخۂ حمیدیہ" مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۶ء

کہ قلمی نسخہ بھوپال پہنچنے کے بعد ایک بار پھر اصلاح اور اضافہ کے لیے دہلی گیا۔ لیکن یہ قیاس بھی پروفیسر حمید احمد خاں کے نزدیک بے بنیاد ہے۔ مفتی صاحب کے مطبوعہ نسخے کا اہم نقص یہ ہے کہ اس میں قلمی نسخے کی اصل ترتیب کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ بعض جگہ مفتی صاحب سے یہ فروگذاشت ہوئی ہے کہ وہ مطبوعہ نسخے اور قلمی نسخے کے متن کے اندراجات میں امتیاز نہیں کر سکے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے مطبوعہ نسخے میں یہ کمزوریاں نہیں ہیں اور "نسخۂ حمیدیہ" کا نقش ثانی، نقش اول سے زیادہ مفید و معتبر ہے۔ ساتھ ہی پروفیسر حمید احمد خاں نے "نسخۂ حمیدیہ" کے سلسلے میں بعض ایسے اہم سوالات اٹھائے ہیں جو اہلِ تحقیق کے لیے توجہ طلب ہیں۔ مثلاً عبدالعلی، عبدالصمد مظہر، اور آغا علی جنھوں نے غالب کے اشعار پر گاہ بگاہ صاد کیا ہے، کون حضرات ہیں؟ حافظ معین، جنھوں نے پورا دیوان خوش خط لکھا ہے، کون صاحب تھے؟ غالب نے قیام دہلی کے زمانے میں کون کون سی غزلیں کہی ہیں اور کون کون سی غزلیں آگرے کی یادگار ہیں؟ مختصر یہ کہ "نسخۂ حمیدیہ" مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں کئی وجوہ سے بہت اہم ہے۔ اس میں نسخۂ حمیدیہ اور غالب کے متعلق بعض مغالطوں کو دور کیا گیا ہے اور بعض ایسے مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے جن کی تفتیش غالب کے سلسلے میں بہت ضروری ہے۔

کلامِ غالب کی تنقید کے سلسلے میں بھی پروفیسر حمید احمد خاں نے اردو، انگریزی میں کئی مقالے لکھے ہیں لیکن سب سے اہم اور منفرد مقالہ وہ ہے جو بعنوان "غالب کی شاعری میں حسن و عشق" اول اول فروری ۱۹۴۹ء کے ہمایوں (لاہور) میں شایع ہوا۔ نظرِ ثانی کے بعد اب وہ "تنقیدِ غالب کے سو سال"[1] میں شامل ہے۔ ڈاکٹر بجنوری کے مقالے کے بعد کلامِ غالب پر یہ دوسرا تنقیدی مقالہ تھا جس نے غالب کی طرف پھر ایک بار لوگوں کو متوجہ کیا۔ یہ مقالہ ڈاکٹر بجنوری کے مقالے کی طرح اپنے قاری کو جذباتی سطح پر متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کا رخ جذبے سے کہیں زیادہ فکرِ سنجیدہ کی جانب ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، اگرچہ فلسفے کے آدمی تھے لیکن محاسن کلامِ غالب میں ان کا رویہ عموماً فلسفیانہ نہیں جذباتی ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کو بھی اگرچہ غالب اور کلامِ غالب سے جذباتی لگاؤ ہے لیکن اس لگاؤ کو انھوں نے فکر و شعور کی گرفت میں رکھا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مقالہ قاری کے جذبات کو نہیں فکر و ذہن کو اپنا مخاطب بناتا ہے۔

غالب کے متعلق بعض ناقدین کی رائے ہے کہ ان کا کلام فکر و فلسفہ کی گہرائی، نفسیاتِ انسانی کی گرہ کشائی اور مسائلِ حیات کی ترجمانی کے لحاظ سے تو بہت بلند پایہ ہے۔ لیکن حسن و عشق کے باب میں اُن کے یہاں وہ تعمق و تنوع نظر نہیں آتا جو اردو کے بعض دوسرے شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کا مدلل و مربوط مقالہ اس رائے کی تردید کرتا ہے۔ اس مقالے کی ابتدائی سطریں دیکھیے:

"غالب کے اردو و فارسی کلام میں حسن و عشق کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔ تعداد کے لحاظ سے پورے کلام میں اس مضمون کے اشعار ایک تہائی کے قریب ہوں گے۔ ان

---

[1] "تنقیدِ غالب کے سو سال" مطبوعہ مجلس یادگارِ غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۹ء

میں وہی تنوع، جدت طرازی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے جو دیوان و کلیات کے دوسرے مضامین کا امتیاز خاص ہے اگر مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی حصہ چھوڑ جاتے تو بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے شعرا میں ہوتا۔ ان اشعار میں محض رنگا رنگ طلسمات کے بند دروازے ہی نہیں کھلتے، ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے اس دنیا کی آب و ہوا ہر طبیعت کو سازگار نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی وسعت اور بوقلمونی کا یہ عالم ہے کہ ہر موقع کی مناسبت سے دل کش منظر بکثرت ملتے ہیں انسانی فطرت کے نامحدود پہلو، جذبۂ عشق کے ماتحت جس طرح بنتے، سنورتے، بگڑتے، پگھلتے اور ڈھلتے ہیں۔ اس کی ترجمانی میں شاعر نے اپنا تمام جوشِ تخیل اور پورا زورِ قلم صرف کیا ہے[1]۔"

یہ دعویٰ بے دلیل نہیں ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے غالب کی ساری اردو فارسی شاعری کو نظر میں رکھ کر نتیجہ اخذ کیا ہے۔ تقریباً پچاس صفحوں کے طویل مقالے میں اپنی بات کو سمجھانے کے لیے تحلیل و تجزیہ، توجیہہ و تاویل اور استدلال و اظہار کا ایسا خوبصورت پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اور اپنے خیال کی عکس ریزی کے لیے جگہ جگہ اشعار و امثال کے ایسے مرقعے پیش کیے گئے ہیں کہ قاری کو پروفیسر حمید خاں کی رائے سے اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے۔ مقالے کا یہی وہ رخ ہے جس نے اردو ادب کے طالبین کو چونکایا ہے اور پروفیسر حمید احمد خاں کی رائے کو غالب شناسی کے سلسلے میں ہمیشہ کے لیے مشعلِ راہ بنا دیا ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں نے غالب اور غالب کو صرف اپنے مطالعے کا موضوع نہیں بنایا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے دوسروں کو بھی غالب پر کام کرنے کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ غالب سے دلچسپی رکھنے والوں پر ان کا ایک احسان یہ ہے کہ ان کی توجہ سے غالب کی ساری اردو فارسی نثر و نظم مفید حواشی اور کارآمد مقدموں کے ساتھ مطبوعہ شکل میں دستیاب ہو گئی۔ اس کے لیے انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں ایک جامع منصوبہ تیار کرایا۔ مجلس یادگار غالب نے ان کی سرپرستی میں غالب کی ساری تصانیف کو متنی صحت کے ساتھ شایع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

یہ کام بہت مشکل تھا۔ لیکن خاں صاحب مرحوم کی ان تھک کوششوں سے تکمیل کو پہنچ گیا اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اگر اب کسی کتب خانے میں مجلس یادگار غالب کی مطبوعات موجود نہ ہوں تو اس کتب خانے کو مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ناقص ہی سمجھا جائے گا۔

نثر و نظمِ غالب کی پندرہ مجلّدات کے علاوہ اس موقع پر مجلس یادگارِ غالب پنجاب یونیورسٹی نے چار کتابیں اور شایع کیں۔

---

[1] "تنقید غالب کے سو سال" ص ۲۳۲ مطبوعہ مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۹ء

(۱) "تنقید غالب کے سو سال" مرتبہ فیاض محمود اور اقبال حسین

(۲) "غالب تاثرات کے آئینے میں" مرتبہ عبدالشکور احسن اور سجاد باقر رضوی

(۳) اشاریۂ غالب از سید معین الرحمٰن

(۴) — GHALIB. A CRITICAL INTRODUCTION از سید فیاض محمود

پہلی کتاب میں ۱۸۶۹ء سے ۱۹۶۹ء تک غالب پر لکھے جانے والے اُن تنقیدی مقالات کا انتخاب ہے۔ جن میں کوئی نئی یا اوریجنل بات کہی گئی ہے۔ دوسری کتاب میں ملک کے ممتاز اہلِ قلم نے یہ بتایا ہے کہ اُن کی ذاتی زندگی کو غالب نے کس کس طرح سے متاثر کیا ہے۔ تیسری کتاب میں تصانیفِ غالب کی مختلف اشاعتوں کے ساتھ ساتھ، غالب پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی تلخیص مہیا کی گئی ہے — چوتھی کتاب انگریزی زبان میں ہے اور اس کا اصل مقصد انگریزی خواں طبقہ سے غالب کو متعارف کرانا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ پروفیسر حمید احمد خان نے مجلس یادگارِ غالب کی اُنیس ۱۹ مطبوعات میں، غالب اور غالبیات کو جذب کر دیا۔ اب جس کتب خانے میں یہ کتابیں موجود ہیں گویا اس میں غالب اور غالبیات سے متعلق ساری بنیادی تحریریں موجود ہیں۔

غالب اور کلامِ غالب سے پروفیسر حمید احمد خان کی یہ دلچسپی اردو سے ان کے گہرے لگاؤ کا ثبوت ہے۔ پڑھائی انھوں نے عمر بھر انگریزی کی لیکن محبت انھیں اردو سے رہی۔ انگریزی ادب اور مغربی علوم سے جو کچھ انھوں نے حاصل کیا، اردو کے حوالے کیا۔ وہ اُردو کے ممتاز ناقد و ادیب ہی نہیں۔ اس کے سچے عاشق اور جاں باز محافظ بھی تھے۔ جب تک رہے اُردو کی حفاظت و اشاعت کے لیے سینہ سپر رہے۔ ہر جگہ اور ہر موقع پر انھوں نے اردو کا نام اونچا رکھا اور اردو کے نام لیواؤں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور کے ناظم کی حیثیت سے اردو کلاسکس کی اشاعت کی رفتار انھوں نے کچھ اور تیز کر دی۔ اُن کی نگرانی میں اساتذۂ قدیم کی درجنوں کتابیں صحتِ متن اور مفید حواشی و مقدمات کے ساتھ منظرِ عام پر آئیں۔ کلاسکس سے متعلق متعدد تحقیقی مقالے بھی شایع ہوئے۔ جشنِ غالب کے موقع پر بھی بعض اہم کتابیں چھاپی گئیں۔ ان میں کلیاتِ غالب (فارسی)، جلد اول و دوم، دیوانِ غالب نسخۂ شیرانی اور یادگارِ غالب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہی نہیں بعض حلقوں کی طرف سے شدید مخالفت کے باوجود انھوں نے پنجاب یونیورسٹی میں تاریخِ ادبیات کا ایک شعبہ قایم کیا۔ مسلمانانِ پاک و ہند نے عربی، فارسی، اُردو اور علاقائی زبانوں کی معرفت جو ثقافتی سرمایہ یادگار چھوڑا تھا۔ اسے کئی جلدوں میں شایع کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ اسی طرح کی اور نہ جانے کتنی باتیں ہیں جو ہمارے دلوں میں خان صاحب مرحوم کی یاد کو تازہ رکھیں گی۔ لیکن اگر وہ یہ کچھ بھی نہ کرتے، تو بھی غالب کے سلسلے کا وہ تحقیقی و تنقیدی کام، جس کا ذکر اوپر قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے، اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اُن کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے بہت کافی تھا۔

جواب طلب امور اور مسوّدات کی واپسی کے لیے
جوابی لفافہ یا ٹکٹ ضرور بھیجیے — "ادارۂ افکار" ہر خط کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

محمد علی صدیقی

اقدار کا سفیر

۲۲ مارچ ۱۹۸۳ء کو پروفیسر حمید احمد خاں بھی مرحوم ہو گئے۔ اس عسرت دخیز کے دور میں وہ آسودہ انقلابی تھے اور نہ دل آزار روشن خیالوں کے اُس طائفہ بے ہنراں کے رکن جو باتیں زیادہ کرتے ہیں اور کام کم۔ پروفیسر حمید احمد خاں کام کے معاملہ میں "سید" تھے۔ جس لگن سے انھوں نے غالب صدی کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی سے تصانیفِ غالب کی چھوٹی موٹی لائبریری طبع کروائی اُس کے ساتھ اگر خود اپنی کتاب "غالب" کو بھی مکمل کر لیتے تو آج ان کا مقام واللہ اعلم کیا ہوتا۔ وہ شارحینِ غالب کی صف سے ہٹ کر کسی اور صف میں ہوتے ــــــ وہ غالباً غالب کے پہلے ثقافتی نقاد (KULTREKRITER) ہو سکتے تھے۔

نئے دور کے سحر طرازوں کے ساتھ ساتھ ہیں کچھ "سحر خوانِ شبستاں"[1] بھی عزیز ہونے چاہئیں آخر ایسے نقطے سے کیوں بات شروع کی جائے جس کے پیچھے علم و دانش کی کوئی حلاوت اور طراوٹ ہی نہ ہو اور پورا ماضی دریا بُرد کرنے کا معاملہ درپیش ہو۔ میں تو سوچتا ہوں کہ آخر کیفیوشس میں بھی کوئی تو مثبت پہلو ہوگا۔ جسے ہم پروفیسر یانگ جنگ (PROF. YANG JUNG KUO) کے بغیر بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ اور ہمارے پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم تو ایک ایسی تہذیب کے رسیا تھے جس کے سب سے بڑے شاعر نے خود کو "آدھا مسلمان" کہنے کے باوجود کبھی پوری تہذیب کی نمائندگی کی تھی۔ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نظریۂ پاکستان کی برِ صغیریت کے بڑے قائل تھے لیکن وہ اس قدر وسیع المشرب بزرگ تھے کہ جب اسلامیہ کالج دو حصّوں میں تقسیم ہوا تو انھوں نے اپنے کالج کے لیے پروفیسر ایرک سپرین کا انتخاب کیا۔ پروفیسر امین مغل کا تقرر بھی خود انھوں نے کیا اور فیض احمد فیض کی گذشتہ اسیری کے دوران اُن کی رہائی کے لیے جس وفد نے بھاگ دوڑ کی تھی اُس کے سربراہ پروفیسر حمید احمد خاں ہی تھے۔

برِ صغیر کی اصطلاح خود مسلمانوں نے وضع کی تھی۔ انگریزوں نے اسے جوں کا توں لے لیا۔ جنگِ پلاسی تک متحدہ

---

[1] یہ ترکیب جون ایلیا کے ایک شعر سے اخذ کی گئی ہے جو یوں ہے ؎

شب خوں ہی اب ہے فیصلۂ کاوشِ کہن
پر کچھ سحر خوانِ شبستاں بھی ہیں عزیز

ہندوستان کا خیال فرضِ محال تھا۔ لیکن جب متحدہ ہندوستان ایک حقیقت بن گیا تو انگریزوں نے "ہندوستانی قومیت" کی تشکیل کے لیے کچھ بنیادی سیاسی ڈھانچہ کھڑا کیا۔ لیکن عجیب معاملہ ہے کہ جب سرسید احمد خاں کا ہیوم کی کانگریس پر اعتراضات میں سب سے تیز اعتراض اس جزیرہ نما ہند و پاک کے کثیر الاقوامی سماج پر تھا۔ جو صرف "بزور جبر ہی یک قومی بنایا جا سکتا تھا"۔ سرسید نے برصغیر کی اصطلاح کا بار بار استعمال کیا اور اس سے جغرافیائی ہندوستان کا کثیر الاقوامی کردار ثابت کرنا مقصود تھا۔ علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد (۱۹۳۰ء) سے لے کر بانیِ پاکستان کے بیشتر خطبات میں برصغیر کی اصطلاح ایک ممکنہ غلط فہمی کے ازالہ کے طور پر یہ حقیقتِ حال کے اعتراف کے طور پر جا بجا استعمال ہوتی آئی ہے۔ تا ایں کہ اپریل ۱۹۷۴ء سے دہلی معاہدہ کے متن میں بھی یہی اصطلاح جغرافیائی معنوں میں استعمال ہوئی بالکل اسی طرح جیسے اسکینڈے نیویا اور آئی بیریا کی اصطلاحیں جو ناروے۔ سوئیڈن۔ ڈنمارک۔ آئس لینڈ اور اسپین۔ پرتگال کے لیے بلا تکلف استعمال ہوتی رہتی ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں انہی معنوں میں برصغیر کی اصطلاح استعمال کرتے تھے اور ہند آریائی مسلم تہذیب کے عاشق تھے۔

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم برصغیر کے مسلم ماضی کے سحر زدہ شبستان کے گرویدہ تھے۔ سیاسی ابتری اور شکست خوردگی کے دور میں اُن کا سارا تفاخر غالب کی ذات میں مرتکز ہو کر رہ گیا تھا۔ انھوں نے طرف دارِ غالب بن کر اس پورے تہذیبی سلسلہ کی وکالت کرنا چاہی تھی جس کی محبت میں غالب نے آئین اکبری کے تصحیح شدہ ایڈیشن کے لیے سرسید احمد خاں کی فرمائش پر ایک ایسی تقریظ لکھی تھی جو سرسید احمد خاں کو بھی ناگوار گذری تھی۔ غالب جتنے ذہین اور حساس تھے اُتنے ہی حقیقت پسند بھی۔ ان کی تقریظ سے ان کی قوم میں شکست خوردگی کی بجائے جذبۂ تعمیر، شوقِ اخذ و اکتساب اور فرسودہ روایت اور تقلید پرستی سے سخت بیزاری کا ثبوت ملتا ہے۔ اس قسم کا نقطۂ نظر اُن کے ہندو ہم وطنوں میں راجہ رام موہن رائے مدیر مراۃ الاخبار کے یہاں بھی ملتا ہے۔ غالب نے اس اخبار کا قیام کلکتہ کے دوران مطالعہ کیا ہوگا۔ اُن کی تقریظ میں مندرج بہت سی دریافتیں اور ایجادات سے سائنسی فکر کی توہمات پر بالادستی ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے پروفیسر حمید احمد خاں نے غالب پر اپنی توجہ مرکوز کر کے دراصل برصغیر کے مسائل کی نبض پر انگلی رکھ دی تھی۔ سرسید احمد خاں دلّی کالج کے تجربہ سے بہت مسرور ہوئے تھے۔ اس کالج میں انگریزی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا اور شاہ عبدالعزیزؒ صاحب نے اس کے حق میں فتویٰ دے کر علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔

غالب کے بعد وہ سرسید احمد خاں، حالی، شبلی، سید سلیمان ندوی اور اقبال کو اپنے سفر کی منزلیں بناتے ہوئے ہمارے دور میں داخل ہوتے ہیں۔ اُن کے برادرِ بزرگ، مولانا ظفر علی خاں مرحوم بھی غالب کے شیدائی تھے، وہ بھی برق صفت اور صاحبِ اسلوب شاعر تھے۔ زمیندار نے مسلم ہندوستان کے مسائل کو ایک مخصوص نظر اور فہم کے ساتھ پیش کیا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم برصغیر گیر شہرت کے مالک تھے اور اس میں کیا تعجب ہو سکتا ہے کہ ایک ایسے خانوادہ میں مسلم برصغیر کی مماثلتوں اور اختلافات کے مقابلہ میں مماثلتوں کا پلڑا جھکا ہوا ہی رہے گا۔ سو وہ رہا بھی۔ اب کیا کیا جائے، یہ اتنی بڑی حقیقت ہے۔ جتنی اس کے برعکس کوئی صورت ہو سکتی ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم یکم نومبر ۱۹۰۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بھائیوں، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حامد علی خاں (کرم آباد وزیر آباد) سے چھوٹے تھے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم وزیر آباد اور لاہور میں ہوئی جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے اور پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ اسلامیہ کالج میں لکچرار مقرر ہوئے۔ مزید تعلیم کے لیے وہ برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی گئے اور وہاں سے ایم۔لِٹ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۸ء تک اسلامیہ کالج میں شعبۂ انگریزی کے صدر رہے۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۳ء تک اسلامیہ کالج کے پرنسپل رہے ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے اور ۱۹۶۹ء میں عین غالب صدی کے ہنگام میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوگئے۔ لیکن اپنی عمر کے آخری لمحہ تک وہ غالب پرست رہے۔ اقبال کے لیے بھی اُن کے دل میں بہت احترام تھا۔ اور وہ کلامِ اقبال کے بہت اچھے شارح بھی تھے۔ لیکن تصانیفِ غالب کی پاکستان میں بڑے پیمانہ پر دوبارہ دستیابی میں پروفیسر حمید احمد خاں کا بہت اہم حصّہ رہا ہے۔ اگر وہ بہت با اثر سیاسی شخصیت ہوتے تو اُن کی معارف پروری کے بڑے چرچے ہوتے۔ لیکن وہ ایک سیدھے سادھے مخلص عالم تھے۔ اس لیے اتنا بڑا کام کر چکنے کے باوجود ابھی تک بہت سے عالموں کو پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی خدمات سے روشناس کروانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اُنھیں اندازہ ہو کہ کام کرنے کے یہ انداز ہوتے ہیں!

۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء میں اُنھوں نے ایشیائی افریقی، اسلامی کانفرنسیں منعقدہ جکارتا اور بنڈونگ میں پاکستانی وفد کی قیادت کی اور وہاں مشرقِ بعید میں تصوف کے موضوعات پر کچھ مواد جمع کیا۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور زیادہ مطالعہ یقینی طور پر تخلیق کے خلاف نہیں جاتا تو کم از کم اس میں تعطّل کی سی کیفیت ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ غالب کے نسخۂ امروہہ کے سلسلہ میں ہونے والی پہلی تقریب میں پروفیسر حمید احمد خاں کی "زبانی" تقریر کے بارے میں نقوش غالب نمبر (۳) میں مدیرِ رسالہ کا ایک نوٹ ہے کہ پروفیسر حمید احمد خاں کی تقریر اس لیے طبع نہ ہو سکی کہ "زبانی" ہونے کی وجہ سے وہ ضبطِ تحریر میں نہ آسکی۔ ٹھیک بھی ہے۔ پروفیسر مرحوم غالب صدی کے اہتمامات میں رات دن ایک کرتے یا مضامین لکھتے۔

پروفیسر حمید احمد خاں نے پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے کچھ عرصے بعد مجلسِ ترقی ادب کی سربراہی قبول کرلی۔ اور یہاں بھی اُن کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں وہ اپنے قریبی دوستوں اور اعزا کو خاصے متاسف اور دل شکستہ نظر آئے۔ خاص طور پر علامہ اقبال کی یومِ ولادت کے سلسلہ میں تنازعہ سے جو اُن کی سرکردگی میں ایک سرکاری کمیٹی نے بہت خوش اسلوبی سے طے کر دیا تھا اور اُسی کی بنیاد پر اقبال کا یومِ ولادت ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء ٹھہرا تھا۔ صحیفہ کا اقبال صدی نمبر بھی اسی وجہ سے اس سال کے شروع میں چھپ گیا۔ لیکن کچھ حضرات، تاریخ کے نظریۂ سازش کے اس قدر شکار رہیں کہ انھوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور علامہ اقبال کی چھوٹی بہنوں کو اُن سے بڑا ثابت کرکے چھوڑا۔ اخبار جہاں مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۷۳ء میں علامہ اقبال کے برادرِ بزرگ کے داماد صوفی نظیر کا ناقابلِ تردید شواہد (جن میں پیدائش سرٹیفکٹ کی نقل بھی شامل ہے) پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کے دعوے کا بہترین ثبوت ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب، کی تہذیبی وفاداریوں میں خود اُن کے صوبہ اور مادری زبان کا حصہ کچھ کم نہ تھا۔ "افکار" کے انقلاب نمبر (سنہ ۱۹۶۰ء) میں عوامی کہانیوں کے ذیل میں پروفیسر حمید احمد خاں کی کہانی ہیر رانجھا (رچنا آب سے پدماتک، بھی شامل ہے) کے مطالعہ سے پنجابی ادب کے اس شاہکار سے اُن کی روحانی وابستگی اُن کی ثقافتی وفاداری کا پہلا دائرہ ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> "اٹھارہویں صدی میں مغلوں کے زوال کے ساتھ فارسی زبان کو بھی زوال آیا اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف بولیوں نے سر نکالا جس طرح دہلی کی مقامی بولی نے اُردو بن کر فارسی کی جگہ لی اسی طرح مغربی پنجاب میں خود اُس علاقہ کی بولی ادبی کاوش کا موضوع بنی میر اور سودا کا پنجابی ہم عصر وارث شاہ ہے جس نے فارسی کے زوال کے بعد اپنے دہلوی معاصرین کی طرح زبان و ادب میں ایک ترقی پسندانہ قدم اٹھایا۔ اُس نے اپنی عظیم الشان پنجابی نظم کے لیے ہیر اور رانجھا کا مقبولِ عام قصہ انتخاب کیا اور اُسے دیہاتی پنجاب کی زندگی کے رس میں اس طرح سمویا کہ اُس کا مزا آج بھی ویسا ہی تازہ ہے۔"

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی وفاداری کا دوسرا دائرہ مسلم ہندوستان کی مرکزیت کے زیرِ سایہ پروان چڑھتی ہوئی تہذیب ہے اور وہ اس دائرہ کے ذریعہ تیسرے اور سب سے بڑے دائرہ یعنی آفاقی دائرہ تک پہنچتے ہیں۔ آج کل بہت سوں کو پہلے دائرہ کی نرگسیت ہی سے فرصت نہیں ہے۔ دوسرے اور تیسرے دوائر کے لیے ریاض کرنے کا یارا کس کو ہے۔ پہلے دائرہ کے بعد اب دوسرے اور تیسرے دوائر بھی پہلے دائرہ کی انا کی بڑھتی ہوئی شکلیں بنتے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت حال میں صحت مندانہ ماضی پر کافی دباؤ پڑ رہا ہے، کلاسیکی ادب سے مغائرت کے سبب جدید ادب کی تفہیم بھی مشکل ہو رہی ہے اور فرد کی طرح قوم بھی برہنہ تن نظر آ رہی ہے۔ ماضی سے غافل، حال سے بیزار اور مستقبل سے خائف لوگوں میں خوفناک نفسیاتی خواہشات پیدا ہو جاتی ہیں اور آج کچھ ایسا نظر آ رہا ہے کہ اقدار کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے لیکن متبادل اقدار واضح طور پر کہیں آس پاس نظر نہیں آتیں۔ ممکن ہے کہ وہ بہت ہی کم لوگوں کی تحویل میں ہوں۔ لیکن مثبت اخلاقی اقدار کی عوام الناس تک عدم رسائی سے ایک ایسا خلا پیدا ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے جسے ہم ایک طویل برزخ کا نام دے سکتے ہیں اور جس سے باہر نکلنے کے لیے ایک شعوری جد و جہد کی ضرورت ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی تصانیف میں ارمغانِ حالی، اسوۂ حسنیٰ، دیوانِ غالب کا نسخۂ حمیدیہ اور تعلیم و تہذیب خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ غالب اور اقبال پر اُن کا نامکمل کام اور دیگر بہت سے خطبات اور مضامین کے علاوہ چند سربرآوردہ انگریزی شعرا پر اُن کے مضامین بھی ہیں۔ یہ سب کچھ انھیں مشرق اور مغرب کے ادب پر ایک مسلمہ اتھارٹی بنا دینے کے لیے کافی ہے۔

پروفیسر حمید احمد خاں کے سیاسی خیالات کچھ بھی ہوں۔ لیکن وہ ماضی کی صحت مند روایات کے بڑے دھڑلے دار وکیل تھے۔ وہ صحیح معنوں میں سحر خوانِ شبستان میں سے ایک تھے۔

حامد علی خاں

حمید احمد خاں کی لفظی تصویر

اسلامیہ کالج لاہور کے "حبیبیہ ہال" میں ۲۵ر مارچ ۱۹۷۴ء کو پروفیسر حمید احمد خاں کی یاد میں جو جلسہ منعقد ہوا، اُس میں اُن کے بھائی، حامد علی خاں نے حسبِ ذیل تقریر کی :۔

جنابِ صدر! —— خواتین اور حضرات! ——

نصف صدی سے زاید مدت کے بعد آج پھر میں اس قدیم درس گاہ میں حاضر ہوا ہوں، جہاں برسوں پہلے میں نے ایک بے فکر اور خوش باش نوجوان طالبِ علم کی حیثیت سے داخلہ لیا تھا، اور آج میں ایسے شدید درد و غم کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں، جس کی شدت لمحہ بہ لمحہ شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس وقت دماغ کی کیفیت یہ ہے کہ احباب کی باتیں سنتا ہوں، مگر ان کا مفہوم میرے ذہن میں قایم نہیں ہوتا۔ ایسا ماؤف دماغ کس طرح، اور کہاں سے وہ طاقت لائے کہ اس پر جو گزری ہے، اُس کی کیفیت آپ سے بیان کر سکے۔

میں نے جب کل اس جلسے میں شرکت کا وعدہ کیا تھا، تو مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ مجھ سے کسی تقریر کی توقع بھی رکھی جائے گی۔ میری غرض صرف یہ تھی کہ اسلامیہ کالج کے اس جلسے میں ضرور شریک ہوں، جو میرے چھوٹے بھائی کی یاد میں منعقد ہو رہا ہے۔ یہ اسلامیہ کالج، جس کا میں قدیم طالبِ علم ہوں، حمید احمد خاں، یہاں کچھ مدت طالبِ علم کی حیثیت سے بھی رہے اور ایک طویل زمانہ انھوں نے استاد کی حیثیت سے بھی گزارا۔ اس کالج سے اُن کا تعلق مجھ سے زیادہ رہا ہے۔ میں نے چاہا کہ میں بھی یہاں آؤں، اور کچھ وقت اُن کی یاد میں یہاں بیٹھ کر آپ کے ساتھ گزاروں، مگر آج صبح اخباروں میں اپنے نام کے ساتھ تقریر کا لفظ دیکھ کر میں پریشان ہوا، کہ میں نے کسی تقریر کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ اور اب تو یہ مضمر طور پر میرا وعدہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ اب میں اسے کس طرح پورا کروں؟

حمید احمد خاں میرے بھائی، اور دوست، اور ایک ساتھ کھیلے ہوئے رفیق تھے۔ مدتوں ہمارا لکھنا پڑھنا بھی ایک ساتھ ہوتا رہا۔ وہ مجھ سے کچھ چھوٹے تھے، مگر ہمارے تعلقات میں قریب قریب ہم عمری ہی کی کیفیت رہی، اور میں نے بھی اُن سے بہت کچھ حاصل کیا۔ آج صبح میری پریشانی میں پھر انھیں کی روح میری مدد کو پہنچی اور اُس نے مجھے آپ سے قطعی شرمساری سے بچا لیا۔

جب وہ "جامعۂ پنجاب" کے وائس چانسلر تھے، اُن دنوں یونیورسٹی کے خبرنامے میں اُن کا ایک مختصر سا مضمون

چھپا تھا۔ وہ پیدائشی طور پر استاد تھے۔ ان کے دل میں اپنے استادوں کا بہت احترام تھا، اور وہ چاہتے تھے کہ اُن کے شاگرد بھی انھیں کی طرح اپنے والدین اور استادوں کا احترام کریں۔ آج صبح، جیسے اِلقا ہوتا ہے، اُن کا وہ مختصر مضمون دفعتہً میرے ذہن میں روشن ہوا اور میں نے سوچا کہ شاید اسی کے ذریعے سے میں کوئی بات کر سکوں۔

اُس مضمون میں حمید احمد خاں نے بتایا تھا کہ عمر بھر، جب انھیں کوئی مشکل پیش آئی، انھوں نے اپنے والدِ ماجد کے طریقِ کار کو اپنے لیے دستور العمل سمجھا۔ وہ براہِ راست والدِ مرحوم کے متعلق بہت کم جانتے تھے۔ کیونکہ اُن کی وفات کے وقت حمید احمد خاں کی عمر چھ سال سے بھی کم تھی۔ لیکن ہم دونوں اپنی والدۂ ماجدہ سے اور دوسرے بزرگوں سے والدِ مرحوم و مغفور مولانا سراج الدین احمد خاں کی صفاتِ حسنہ کا ذکر سنتے آئے تھے اور ہماری کوشش رہتی تھی کہ ہم کوئی ایسی حرکت نہ کریں کہ ہم ان کی روح سے شرمسار ہوں۔ مجھ سے کہیں زیادہ حمید احمد خاں اُن کی پیروی میں کامیاب ہوئے۔ جامعۂ پنجاب کے خبرنامے میں حمید احمد خاں نے طلبہ کو یہی ہدایت کی تھی کہ وہ کسی نہ کسی بلند کردار بزرگ کو اپنا روحانی رہنما قرار دے لیں، جس طرح خود انھوں نے والدِ مرحوم کی روح اور اُن کے کردار کو اپنا رہنما بنایا تھا۔

آج صبح نو بجے کے قریب مجھے برادرِ معظم مولانا ظفر علی خاں کے لکھے ہوئے اُس مرثیے کا دوسرا بند یاد آیا، جس میں مولانا نے جنوری سنہ ۱۹۰۹ء میں والدِ مرحوم کے اوصافِ حمیدہ کی تصویر کشی کی تھی۔ مجھے آج یوں محسوس ہوا کہ یہ مرثیہ حمید احمد خاں کی بھی تصویر ہے۔ یہ تصویر میں آپ کو پیش کروں، تو یقیناً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے۔ کہ یہ حمید احمد خاں کی تصویر ہے اور آپ کو یہ اندازہ بھی ہوگا کہ وہ والدِ ماجد کے کردار کو اپنا نصب العین بنانے میں کس قدر کامل طور پر کامیاب ہوئے۔

واضح رہے کہ یہ اشعار میرے نہیں ہیں۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا یہ مرثیہ ہمارے برادرِ اکبر مولانا ظفر علی خاں نے والدِ مرحوم و مغفور کی رحلت کے موقع پر سنہ ۱۹۰۹ء میں لکھا۔ اور یہ والدِ مرحوم کے جاری کردہ اخبار "زمیندار" میں چھپا تھا۔ میں اِس مرثیے کا دوسرا بند آپ کو سناتا ہوں۔ آپ حضرات سے بہتر حمید احمد خاں سے کون واقف ہے۔ آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ حمید احمد خاں کی بھی ہو بہو لفظی تصویر ہے ؎

وہ اپنے فن میں مُلک کے اندر یگانہ تھا
یکتائے روزگار و وحیدِ زمانہ تھا

حکمِ قضا سے چارہ نہیں ہے مگر ابھی
پیمانہ اُس کی عمر کا پورا بھرا نہ تھا

ہمت کے اعتبار سے تھا ہمسرِ فلک
یوں دیکھنے میں گرچہ قد اُس کا میانہ تھا

اُس کے قلم پہ ختم تھیں جادو نگاریاں
ہر نقطہ اُس کا ایک دل آرا فسانہ تھا

تھی اُس کے لاگ میں بھی ادا اک لگاؤ کی
اُس کے سوا یہ رنگ کسی اور کا نہ تھا

اُس کی زباں ہمیشہ رہی ترجمانِ دل
اِس واسطے کبھی وہ کسی سے دبا نہ تھا

اِن صاف گوئیوں کی بدولت تمام عمر
جتنا کہ چاہیے تھا، وہ اُتنا بڑھا نہ تھا

طبعِ غیور دی تھی خداوند نے اُسے
آگے کبھی کسی کے سر اُس کا جھکا نہ تھا

نیت میں راستی تھی، ارادے میں تھا خلوص
اُس کے کسی خیال میں شامل ریا نہ تھا

رکھتا وہ دشمنوں کی طرف سے نہ تھا عناد — ملتا وہ دوستوں سے اگر مخلصانہ تھا
وہ بے کسوں کے واسطے بنتا رہا سپر — اور سرکشوں کے حق میں وہ اک تازیانہ تھا
کی آ کے اُس نے غیب سے اُس قوم کی مدد — جس کا بجز خدا کے کوئی آسرا نہ تھا
اُس قوم بے زباں کی بنا آ کے وہ زباں — جس میں سے ایک شخص بھی نطق آشنا نہ تھا
وہ پاک نفس تھا غرض اپنی مثال آپ — ذکر اُس کا آج خلق میں یوں غائبانہ تھا

شہبازِ ما پرید و رہِ آسماں گرفت
مُرغے نہ رفتہ است کہ دیگر تواں گرفت

ابنِ انشا کا تازہ ترین سفرنامہ

ابن بطوطہ کے تعاقب میں

ایران، لنکا، لندن، یا پیرس، جرمنی، جاپان، فلپائن اور ہانگ کانگ کے سفروں کا حاصل۔ شگفتہ، رواں دواں کارٹونوں سے مزین، آفسٹ طباعت، کپڑے کی جلد، خوبصورت گرد پوش شایع ہوگیا ہے۔ قیمت ——— ۱۵ روپے

ابنِ انشا کے دوسرے سفرنامے

چلتے ہو تو چین کو چلیے	۶ روپے	(طبع سوم)
آوارہ گرد کی ڈائری	۱۲ روپے	(طبع دوم)
دنیا گول ہے	۱۲½ روپے	(طبع دوم)

اور طنز و مزاح کا شاہکار
اردو کی آخری کتاب (طبع دوم)

تمام کتابیں نہایت خوبصورت، تحفے میں دینے کے قابل

مکتبہ دانیال — وکٹوریہ چیمبرز (۲) صدر۔ کراچی ۳
فون ۵۱۱ ۷۵۷

بیگم اکبر علی تور

میرا پیارا بھائی

—— پروفیسر حمید احمد خاں ——

ذیل کا خط پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی چھوٹی بہن بیگم اکبر علی تور نے اپنے جان سے پیارے بھائی کی رحلت کی اطلاع دینے کے لیے اپنے بیٹے ڈاکٹر عارف اکبر علی تور کو لکھا ہے۔ عارف لیبیا میں ڈاکٹر ہیں۔ مرحوم انھیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ عارف کو بھی اپنے ماموں سے والہانہ محبت اور عقیدت تھی۔ وہ جنوری ۱۹۷۴ء میں اپنے عزیزوں سے ملنے پاکستان آئے تھے۔ ۷/ فروری ۱۹۷۴ء وہ لیبیا واپس چلے گئے۔ عارف کو رخصت کرتے وقت مرحوم نے اپنے بھانجے سے کہا تھا کہ "عارف! تم نے بڑا ہی نیک کام کیا جو آکر ہم سے مل لیے۔ تمھارے دوبارہ پاکستان واپس آنے پر میں تو یقیناً زندہ نہیں رہوں گا۔" مرحوم کے یہی الفاظ ہیں جو بیگم تور کو تڑپا رہے ہیں اور اُن سے زیادہ شاید عارف کو تڑپائیں گے۔ یہی احساس ہے جس نے بیگم تور سے یہ خط لکھوایا ہے۔ خط ایک دردانگیز اور دل گداز مرثیہ ہے، جو بہن نے بھائی کی جدائی کے غم میں لکھا ہے۔

بیگم اکبر علی تور وہی محترم خاتون ہیں جن کے کئی افسانے ہمایوں میں ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۴ء کے درمیان ز۔ب کے نام سے چھپے اور بہت پسند کیے گئے۔

۳۷ - جی گلبرگ

مورخہ ۱۲/ اپریل ۱۹۷۴ء

برہم نہ یہ بزمِ شادمانی ہوتی
اے کاش نہ ختم یہ کہانی ہوتی
اے کاش سدا قرارِ گُل کو ہوتا
اے کاش بہار جاودانی ہوتی

میرے یتیم بچے عارف! خدا تم کو اس صدمۂ عظیم کو برداشت کرنے کی قوت عطا کرے۔ السلام علیکم۔! آج پورے بارہ دن کی سوچ بچار کے بعد اپنے مفلوج دل و دماغ پر بوجھ ڈال کر، اپنے شکستہ دل کے ٹکڑوں کو بڑی مشکل سے جوڑ کر تمھیں اپنی پُرالم زندگی کا نیا المیہ سنانے کی جرأت کر رہی ہوں۔ جس کا ایک ایک لفظ میرے خون کے آنسوؤں میں ڈوبا ہوا ہے۔

میرے پیارے بیٹے! میں نے تمھارے بچپن میں تمھیں کتنی دلچسپ اور نصیحت آموز کہانیاں سُنائی تھیں اور ڈراونی کہانیوں سے تمھیں بچایا تھا۔ مگر آج جو کہانی لاہور سے بیٹھ کر تمھیں لیبیا میں سُنا رہی ہوں۔ بڑی ہی اذیت ناک، بڑی ہی دردانگیز ہے اور بے حد دردناک انجام پر ختم ہوتی ہے۔ یہ کہانی تمھارے پیارے ماموں پروفیسر حمید احمد خاں کے آخری سفر کی کہانی ہے۔ وہ میرے جان سے پیارے بھائی تھے جن کی سلامتی کی دعائیں مانگتے میں نے ایک عمر گذار دی۔ میرے مشفق بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ میرے بچپن کے رفیق، میرے ساتھ کھیلے ہوئے ہم جولی اور محترم استاد بھی تھے، مجھ بے علم کو ہر قسم کے علم سے شناسا کرنے والے۔ اردو کے علاوہ انگریزی کے بہترین مصنفین کی دل کش تصانیف گھنٹوں سناتے، اپنے علم کا نچوڑ مجھ جیسی اَن پڑھ کے کانوں میں ڈالتے، شکسپیئر، کیٹس، بائرن، شیلے، ورڈز ورتھ اور دنیا کے ہر بڑے مصنف، ہر بڑے شاعر کا کلام گھول گھول کر مجھے پلاتے۔ ہمیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر خوابِ غفلت سے جگا کر اقبال اور غالب کا کلام سنانے والا عظیم اُستاد آج "غالب روڈ" ہی کے قبرستان کا دائمی مقیم بن گیا۔

اوپر لکھی ہوئی باتیں تو کسی پُرانے عہد کی یاد ہیں۔ مگر اب بھی عمر کے اس دور میں بھی میری زندگی کی ہر مشکل میں سینہ سپر ہو کر میرا بازو تھام لیتے۔ جس کانٹے میں بھی میرا دامن الجھ رہا ہوتا، بڑے پیار سے جُھک کر اسے میرے دامن سے نکال دیتے۔ میں بدنصیب اُن کی کون سی بات یاد کروں اور کون سی بھول جاؤں؟ میری ہر خوشی میں مجھ سے دس گُنا خوش ہونے والے، میری ہر پریشانی اور مصیبت کو مجھ سے دس گنا زیادہ محسوس کر کے میرے ہر دکھ کا مداوا کرنے والے، میرے بچوں سے مجھ سے بھی زیادہ محبت اور شفقت کرنے والے، اپنے لائق، فائق، بچوں کے مقابلہ میں صرف اپنی محبت سے ہمیشہ میرے بچوں کو اونچا درجہ عطا کرنے والے، فقیروں، غریبوں، گھر کے نوکروں معذوروں اور بوڑھوں سے یکساں دلی احترام اور دلی محبت سے پیش آنے والے! آہ وہ شان دار شخص جس سے سارے لاہور کا وقار قایم تھا، آج سارے پاکستان میں اُس عظیم راہنما، اُس قائدِ اعظم کے قدموں کے نشان پر چلنے والے درویش صفت راہبر کا ماتم برپا ہے، جس کے پاک قدموں سے، جس کے پُرنور سراپا سے اکثر اور بار بار میرے تاریک اور تنہا گھر میں روشنی کی کرنیں پھوٹ پڑتی تھیں۔ ہائے اب میں کس کے انتظار میں اپنا دروازہ کھلا رکھوں گی؟ آہ ظالم موت نے، بے رحم تقدیر نے اُسے جلدی جلدی اپنے کام ختم کرتے دیکھ کر، اُسے اپنی سنگین گرفت سے بچ نکلتے دیکھ کر آخر اپنا تیر چلا دیا۔ پل بھر میں اُن کارناموں پر جنھیں سرعت سے وہ پورا کر رہا تھا، جھپٹ پڑی، پل بھر میں وہ خوش و خرم گھرانہ جو ایک خوش نما چمن زار تھا، جس میں آئے دن دوستوں اور عزیزوں کے لیے وسیع دسترخوان بچھتے تھے اس پر ایک دم اپنی تاریک آندھی چلا دی، پل بھر میں معصوم بچوں سے دنیا کی سب سے بڑی دولت اُچک کر انھیں حیران و سرگرداں، تنِ تنہا زندگی کی راہ پر چھوڑ دیا۔ اُن کی جنت اُن سے چھین کر اپنے بھیانک دامن میں چھپا لی۔ پل بھر میں اُن کی بھولی بھالی لاڈلی، ہر رنگینی پر جان دینے والی

بیوی کے سارے رنگ چھین کر چل دی۔ ہائے میں کس سے پوچھوں' ان رنگوں کو بکھیر کر اُس ظالم کو کیا ملا؟

آہ مجھے اخباروں میں اپنے نوجوان بھائی کی عمر کا حساب لکھا دیکھ کر دل میں تیر لگتا ہے۔ شاید کوئی اس عمر میں بوڑھا ہو جاتا ہو۔ مگر وہ تو آخر دم تک ایک نوجوان لڑکے کی سی زندہ دلی اور تیز رفتاری سے دوڑ بھاگ کر رہے تھے۔ زندگی کی کٹھن راہوں پر ایک شوخ لڑکے کی طرح موت کے تعاقب سے بچ نکلنے کے لیے چھلانگ پر چھلانگ لگا رہے تھے۔ آخری لمحوں تک کیا زندگی کا رکھ رکھاؤ، کیا گھر کے کام، کیا لباس کی ایک ایک سلوٹ کی فکر، کیا بچوں کو خوش کرنے کے لیے تفریح کے پروگرام، کیا ان کے امتحانوں کی تیاری کرانے کی مصروفیت، کیا اپنی نادان قوم کو راہِ راست کی طرف کھینچ لانے کے پُرعزم ارادے! وہ جوان تھے' جواں ہمت تھے اور جوان ہی چلے گئے۔ آخری لمحہ تک بھی جب تک ہوش نے کام دیا اُن کے آخری الفاظ غالباً یہی تھے۔ "وقار میرا انتظار کرو' میں دفتر جانے کے لیے تیار ہوں۔ چند ہی لمحے قبل سیرت النبیؐ پر اپنا مضمون دُہرا رہے تھے' جو شام کو ریڈیو کے لیے ریکارڈ کرانا تھا' آہ وہ شام جو پھر کبھی ان کی زندگی میں نہ آئی۔ اے میرے خدا اُن کتابوں' اُن کارناموں کا کیا ہوگا' جو میرے جواں ہمت بھائی کے پیشِ نظر تھے۔ اُن کے ماتمی جلسوں میں اپنے مفلوج دل و دماغ سمیت اپنے آپ کو گھسیٹ کر شامل ہوئی اور اس محرومی کا احساس اور شدت سے بڑھ گیا کہ اب کوئی شخص اُن خوبصورت الفاظ میں' اُس دل کی تہہ میں اتر جانے والی پیاری' کڑک دار آواز سے بول ہی نہیں سکتا۔ بڑے بڑے مقرروں نے آنسو بہاتے ہوئے ان کی یاد تازہ کی' مگر میں باغِ بہشت کی ٹھنڈی شبنم میں ڈھلے ہوئے۔ وہی الفاظ' وہی نایاب اندازِ تقریر سننے کے لیے گوش برآواز رہی۔ جی چاہتا تھا مائیکروفون کو ہٹا کر خود کھڑی ہو جاؤں اور چیخ چیخ کر اُن کے سوگوار دوستوں کو بتاؤں کہ انھوں نے کیسا لعلِ بے بہا کھو دیا ہے۔

عارف خدا تم کو سلامت رکھے یہ کہانی بڑی لمبی ہے اور تمھاری ماں اگلا دردانگیز باب سنانے کی تاب نہیں رکھتی۔

آہ! — اب ستارہ[1] نے کانپتی ہوئی اُنگلیوں سے میرا قلم خود لکھنے کے لیے تھام لیا ہے۔ اس سے پہلے پاکستان کے تمام ماتمی اخبار اُس نے ہی تم کو بھیجے تھے۔ — خدا حافظ! —

"ایمن" کے بعد رفعت سلطان کی چونکا دینے والی
نظموں اور غزلوں کا مجموعہ
○ "آواز" ○
زیرِ طبع
باہو پبلشرز، دربار حضرت سلطان باہو، ضلع جھنگ

[1] بیگم تور کی صاحب زادی اور ڈاکٹر عارف کی بہن —

جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن

ایک اور شمع خاموش ہوگئی

(تقریر جو ۲۵ مارچ ۱۹۷۴ء کو اسلامیہ کالج لاہور کے تعزیتی اجلاس میں کی گئی)

جیسا کہ ابھی ہمارے دوست نے ارشاد فرمایا مجھے یہ سعادت نصیب ہے کہ میں مرحوم حمید احمد خاں کے ساتھ اسکول میں ہم جماعت تھا۔ اس کو تقریباً ساٹھ برس سے اوپر ہو چلے ہیں۔ اس وقت سے جو رفاقت قایم ہوئی، وہ عمر بھر قایم رہی اور اب موت کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔ ان کی ہم کاری مجھے اور مقامات پر بھی نصیب رہی۔ مثلاً یونیورسٹی میں مجلس زبانِ دفتری میں، ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں، مرکزی اُردو بورڈ میں، مجلسِ ترقیِ ادب میں، بزمِ اقبال میں۔ اتنے اداروں کے ساتھ تعلق رکھتے ہوئے، اُن کو میں قریب سے دیکھ سکا۔ میرا یہی تاثر ہوا کہ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں، اُسے مخلصانہ انداز سے اتنے انہماک سے کرتے ہیں کہ رشک آنے لگتا ہے۔ کام کی لگن میں وہ اپنی صحت کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ بارہا میں نے اُن سے کہا کہ آپ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ ضرور کیا کریں۔ آپ کام زیادہ کرتے ہیں۔ اس لیے آپ بیمار ہونے لگتے ہیں، تو کہنے لگے، بھئی فرصت کم ہے اور کام زیادہ۔ میں نے اِن سے ہر چند عرض کی کہ

کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد

آپ صحت کو خراب کر کے کام سے عہدہ برآ نہیں ہو سکیں گے۔ لیکن بہر حال اُن کا ایک اُصول تھا۔ آخری دم تک انھوں نے جس شغف اور انہماک کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے۔ وہ ہمارے نوجوانوں کے لیے ایک اُسوۂ حسنہ ہے۔ ایک شمع فروزاں ہے۔ جس کی روشنی میں وہ اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں۔ حمید احمد خاں کی موت ایک عالم اور ادیب کی موت ہے۔ ایک شفیق استاد کی موت ہے۔ ایک دردمند مخلص انسان کی موت ہے اور ایک دردمند محب وطن پاکستانی کی موت ہے۔ ان میں یہ سب خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ ان تمام کاموں سے اس لیے بخیر و خوبی عہدہ برآ ہو سکے کہ انھوں نے جیسا کہ جسٹس انوار الحق صاحب نے فرمایا، اپنی اصول پرستی کو کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔

کاروبارِ زندگی میں کسی لگی لپٹی رکھنے کے وہ قائل نہ تھے۔ ریا اور منافقانہ انداز کبھی اُن کے نزدیک تک نہ گیا۔ چنانچہ جس سے اختلاف ہوا اسے برملا اور بالمشافہ بیان کیا اور یہ نہیں کیا کہ اگر اختلاف ہوا ہو تو اسے چھپا کر خود منافقانہ انداز اختیار کر لیتے۔ اس قدر خوبیوں کے مالک کا جب انتقال ہو جائے تو یہ ایک فطری امر تھا کہ تمام آنکھیں اشک بار ہوں اور دل سوگوار۔ ایک صاحب کا مقولہ ہے کہ انسانی عظمت کا معیار یہ ہے کہ اُس نے ہم عصروں کو کس حد تک

متاثر کیا۔ اس معیار کی روشنی میں دیکھا جائے تو جیسا کہ جسٹس انوار الحق نے فرمایا ان کی زندگی بڑی کامیاب زندگی تھی۔ اُن کے ہم عصروں نے اُن سے جو اثرات لیے وہ نہایت شاندار تھے۔ اُن کے کردار کے متعلق، ان کی سیرت کے متعلق، اُن کے اخلاق کے متعلق، اُن کے انہماک اور خلوص کے متعلق اور ان کی شفقت اور محبت کے متعلق۔ یہ ایک بڑی بات ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سعدی علیہ الرحمۃ کے وہ اشعار ان پر صادق آتے ہیں جن میں انھوں نے کہا تھا ؂

یادداری کہ وقتِ زادنِ تو
ہمہ خنداں شوند تو گریاں
آنچناں زی کہ وقتِ مردنِ تو
ہمہ گریاں بدند تو خنداں

اُن کی موت پر کون سی آنکھ تھی جو اشکبار نہ تھی، ان کے غم میں کونسا دل تھا جو سوگوار نہ تھا۔ ایک مرحوم دوست کے حضور، ان کی موت پر خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے دل بھی بھر آتا ہے اور آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں۔ جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حمید احمد خان کی موت کے ساتھ پرانے شعلہ آشناؤں کی صف میں ایک اور کمی واقع ہوگئی ہے۔ داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی، ایک اور شمع خاموش ہوگئی۔ اُن لوگوں میں سے اب چند ہی باقی رہ گئے ہیں، جنھوں نے تحریکِ پاکستان کے اولین ایام دیکھے تھے اور جو اُس جذبہ و ولولہ سے آشنا ہوئے تھے جس نے تحریکِ پاکستان کو جنم دیا۔ اللہ کرے کہ ہمارے نوجوان بھی اسی شمع سے اپنے چراغ روشن کریں، جو حمید احمد خان نے جلائی تھی، تاکہ وہ اپنی قوم اور ملک کے مفید شہری ثابت ہو سکیں اور مخلص مسلمان بن سکیں۔

اللہ کریم سے دعا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ہم سب کو توفیق دے کہ ہم ان کے نقشِ قدم پر چل کر، انھیں حقیقی خراجِ عقیدت ادا کر سکیں۔ آمین ــــ

نئے افسانے میں
ایک عظیم اضافہ
○ "بیزار آدم کے بیٹے" ○
رشید امجد کے افسانوں کا مجموعہ، جو نئے
افسانوں کے ارتقاء کا پرتو ہیں
قیمت ـــــــ پندرہ روپے
دستاویز پبلشرز۔ بک سنٹر۔ حیدر آباد روڈ۔ راولپنڈی

جسٹس انوار الحق

ایک باکردار شخصیت

(تقریر جو ۵ ۲ مارچ کو اسلامیہ کالج لاہور کے تعزیتی اجلاس میں کی گئی)

صدر محترم! خواتین و حضرات ——

انسانی زندگی کی یہ معراج اور منزل ہے کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ میرے نزدیک وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو عزت و آبرو سے اُس منزل تک پہنچتے ہیں۔ حمید احمد خاں مرحوم اُن برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک ہیں جو نہایت عزت و آبرو سے اپنی منزل تک پہنچے ہیں۔ گو آج ہمارے دِل اُن کی جدائی کے غم میں نڈھال ہیں اور جذبات سے لبریز ہیں اور اُن کے ساتھ طویل رفاقت کی یادیں اُمڈ کر چلی آرہی ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ وہ واقعی ایک خوش قسمت انسان تھے۔ کہ آخری دم تک اُن کو اپنے نیازمندوں کی عقیدت حاصل تھی۔ اَپنوں کی محبت اور ہر قسم کے جذبات اور نیک تمنائیں اُن کے ساتھ تھیں، اور جس عزت و آبرو سے اُن کے چاہنے والوں نے انھیں پرسوں رخصت کیا ہے اس کا منظر ہم سب کے سامنے ہے۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا اُن پر یہ خاص فضل و کرم تھا کہ وہ اس دنیا سے اِس شان سے اُٹھے ہیں کہ واقعی اُن پر رشک آتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جتنا اُن سے تعلق رہا، جتنی طویل رفاقت تھی، آج دل اُن یادوں کے بوجھ سے دبا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے اسلامیہ کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے آج اس محفل کا انتظام کر کے ہم سب کو شکریے کا موقع دیا ہے کہ ہم اپنے جذبات کا اظہار کر کے اپنے دلوں کا بوجھ کم کر سکیں۔

حمید احمد خاں صاحب سے میری نیازمندی کی ابتدا اسی کالج میں ہوئی اور جیسا کہ ابھی سکریٹری صاحب نے کہا کہ میں اس کالج میں ایم۔اے اقتصادیات میں داخل ہوا۔ مرحوم چونکہ اس مضمون کے اُستاد نہ تھے، بلکہ وہ انگریزی کے ایک نوجوان استاد تھے۔ تو ان سے جو میر التعلق اور نیازمندی کا سلسلہ شروع ہوا تو آج چالیس سال کے بعد بھی اُسی طرح قایم رہا۔

اُس زمانے میں اسلامیہ کالج کی ایک منفرد حیثیت تھی اور میں اپنے آبائی وطن جالندھر سے جب ایم۔اے کے داخلے کے لیے لاہور پہنچا تو گورنمنٹ کالج بھی موجود تھا۔ ایف۔سی کالج بھی موجود تھا لیکن اس کالج کی روایات اور کالج کے اُس وقت کے پرنسپل علامہ یوسف علی اور باقی اُستادوں کا وہ مقام تھا، اور اُن کی وہ شہرت تھی کہ میں نے

اسی کالج میں داخلہ لینا مناسب سمجھا، اور آج تقریباً ۳۷، ۳۸ سال گزر جانے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کا یہ ایک سرمایہ ہے کہ میں اس کالج میں ایم۔اے کی تعلیم کے لیے داخل ہوا۔

پروفیسر حمید احمد خاں اُس وقت ایک نوجوان استاد تھے اور اُن کے حلقۂ احباب میں اِس زمانے کے چند شاگردوں میں سب سے پیش پیش حمید نظامی مرحوم تھے۔ مولانا عبدالستار نیازی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور م۔ش اور ہم ایسے چند اور پروفیسر فیاض محمود اور ڈاکٹر باقر اِس زمانے میں یہاں تھے۔ ان تمام کا مل کر خود ایک ایسا حلقہ بن گیا تھا کہ آج تک، اگرچہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم میں سے بہت سے دوستوں کو چھین لیا ہے اور باقی ہم جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ لیکن اُس زمانے کی یاد آج تک تازہ ہے اور اِن روایات کا ایک حصّہ پروفیسر حمید احمد خاں تھے۔

جب اِن کے شاگرد اُن کی فضیلت کا ذکر کرتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب ہے۔ کہ اس وقت اس پس منظر کو بھی سامنے رکھا جائے کہ یہ اس ادارے کی ایک منفرد خصوصیت تھی۔ کہ اس میں ایسے اُستاد تھے۔ جو اللہ اور رسول کی محبت سے سرشار تھے اور اُن کے دلوں میں اس بات کا جذبہ اور شوق تھا کہ جو نوجوان طالب علم اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اُن کے دلوں میں بھی محبت اور اخلاق حسنہ کی پیروی کو اُن کی زندگی کا لائحۂ عمل بنایا جائے گا۔ حمید احمد خاں صاحب اپنے شاگردوں سے اور ہم نوجوانوں سے جو اُن کے براہِ راست شاگرد نہ تھے۔ لیکن اُن کے حلقۂ اثر یا حلقۂ عقیدت مندی میں آچکے تھے۔ یہ اُن کا سب سے بڑا کمال تھا۔ کہ وہ اپنے علم و فن اور فضیلت کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں میں اس بات کا جذبہ پیدا کرتے تھے کہ زندگی کی راہ میں سب سے اہم بات ایک مسلمان نوجوان کے لیے یہ ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کو سمجھے اور ان پہ عمل کرے۔ حمید احمد خاں صاحب کی اپنی زندگی جو ہم سب کے سامنے ہے۔ اس بات کی ایک زندہ مثال تھی۔

میں نے جیسا عرض کیا، میری نیاز مندی کا سلسلہ اس کالج میں شروع ہوا۔ اس کے بعد مجھے اُن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع اُس وقت ملا جب کہ میرے کچھ بزرگوں نے مجھے اسلامیہ کالج کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا۔ سالہا سال تک پروفیسر حمید احمد خاں صاحب جب اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے اور میں کالج کمیٹی کا صدر تھا تو تقریباً ہر مہینے میں دو چار میٹنگیں ایسی ہوتی تھیں اور ایسے متنازعہ فیہ مسائل پر بحث و تمحیص کا موقع ملتا تھا جس سے اس شخص کے کردار کی عظمت، اس کے حوصلے کی پختگی اور اُس کے افکار کی بلندی کا پتہ چلتا تھا۔ اور یہ حکومت کی طرف سے اُن کی قابلیت اور اُن کے علمی تجربے کا ایک اعتراف تھا کہ اُنھیں یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ اور پھر یہ میری خوش قسمتی سمجھیے کہ یونیورسٹی سنڈیکیٹ کا ممبر ہونے کی حیثیت سے مجھے پھر اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اور ایک مرتبہ پھر میں نے اُن کی عظمت کا مشاہدہ کیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں اور نہ وقت ہے کہ کیا کیا مشکلات پیدا ہوئیں۔ حکومت کے ساتھ کئی قسم کے ٹکراؤ ہوئے، طالب علموں سے سامنے ہوئے، اور سنڈیکیٹ میں خود ہر قسم کی مخالفت کے باوجود حمید احمد خاں نے کبھی اصول پرستی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

اگر مجھ سے یہ کہا جائے کہ اُن کی شخصیت کی منفرد خصوصیات کا ذکر کروں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ بطور انسان، بطور

دوست یا بطور اُستاد کے اُن کی شفقت اور اُن کا خلوص سب سے پہلے دل میں اُبھرتا ہے۔ ذاتی تعلقات میں انسان اُن کے اوپر مکمل طور پر اعتماد کرسکتا تھا اور کبھی انسان کو یہ خطرہ لاحق نہیں ہوتا تھا کہ اگر میں نے کوئی اپنا راز خان صاحب سے کہہ دیا، یا اپنی کوئی کمزوری بیان کردی تو کسی ایسے وقت میں یہ کہیں اس چیز سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ خواتین و حضرات آپ اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ ہم جس معاشرے سے گزر رہے ہیں اُس میں سب سے زیادہ نقصان اور تکلیف اپنے دوستوں سے ہی پہنچتی ہے کیونکہ وہ ہماری کمزوریوں کو پہچانتے ہیں اور ہماری اُن تمام کوتاہیوں سے پوری طرح سے واقف ہوتے ہیں جو ہم نے دوستی کے پردے میں کبھی اُن سے بیان کی ہوں یا اُن کے مشاہدے میں آئی ہوں۔ تو حمید احمد خاں صاحب ایک ایسی ہستی تھے کہ اگر وہ آپ کے دوست ہیں، وہ آپ کے ملنے والے ہیں تو خواہ کچھ بھی ہوجائے کسی کمزوری اور کسی کوتاہی کا اگر اُن کو علم ہے تو اُس سے کبھی آپ کو کوئی ناجائز نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اور ساتھ ہی دوسری صفت یہ تھی کہ خواہ آپ سے کتنی ہی دوستی ہے، کتنا ہی تعلق ہے۔ لیکن اگر آپ کا کوئی مطالبہ ناجائز ہے، اگر آپ نے کوئی ایسا فعل کیا ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے تو پھر حمید احمد خاں میں یہ جرأت تھی کہ وہ خاص طور پر آپ کو کہہ دیں کہ میرے بھائی میں اس معاملے میں آپ کی معاونت اور امداد نہیں کرسکتا کیونکہ یہ آپ نے غلطی کی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اگر آپ مجھ سے مشورہ مانگتے ہیں تو اس میں آپ کو جو نقصان ہونے والا ہے اُس میں کچھ کمی کی جاسکے۔ لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ میں ناجائز طور پر آپ کی امداد کردوں تو یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ یہ میرے نزدیک ایک ایسی چیز تھی، جو آہستہ آہستہ مفقود ہوتی چلی جارہی ہے اور جتنا بھی اس خصوصیت کو عزت اور احترام سے دیکھا جائے کم ہے۔

بحیثیت اُستاد کے اُن کے علم و فضیلت اور اُن کی شفقت کا ذکر اُن کے شاگرد کرچکے ہیں۔ اُس میں مجھے کچھ اضافہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ لیکن اُن میں اُصول پر چلنے کی جرأت اور حق بات کہنے کی ہمت اللہ تعالیٰ نے کوٹ کوٹ کر ودیعت کی تھی۔ اور اگرچہ میں کسی پہ اعتراض کرنا نہیں چاہتا؛ اور میرے نوجوان دوست یعنی طلبہ مجھے معاف کریں۔ لیکن میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یونیورسٹی میں جب طلبہ نے نظم و ضبط کا دامن چھوڑ دیا اور انھوں نے AGITATION کرنا اپنا حق سمجھا یا اپنا شعار بنا لیا تو اُس زمانے میں ایک موقع ایسا آیا کہ یہ نوجوان اپنی بے راہ روی میں حمید احمد خاں جیسے انسان کے بھی خلاف اُٹھے اور ایک موقع پر میں سمجھتا ہوں کہ رحمان صاحب اُس سے پوری طرح واقف ہوں گے اور کچھ اور آپ حضرات بھی جانتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے وائس چانسلر کے دفتر پر دھاوا بول دیا تھا۔ حمید احمد خاں صاحب اپنے دفتر میں کام میں معروف تھے تو یہ لوگ دروازہ کھول کے بے محابہ کمرے میں داخل ہوئے اور کچھ نوجوان بدتمیزی سے اُن کی میز کے اوپر چڑھ گئے اور اُن کو ایک THREATENING — انداز میں جیسے کہ وہ ابھی اُن کو مارنے والے ہیں یا اُن کا گلا گھونٹنے لگے ہیں اُن کی طرف بڑھے اور کہا کہ ہمارے مطالبات آپ کو ماننے پڑیں گے۔ تو اُس وقت اس شخص نے جو جسمانی طور پر اُن کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا، عمر میں ان سے بہت زیادہ تھا، جسمانی طور پر اُن سے کمزور تھا تو اُس شخص نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا میری ساری عمر آپ نوجوانوں کی خدمت میں گذری ہے، اور اگر میرا خاتمہ بھی آپ کے ہاتھوں میں ہے تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔ جب یہ بات انھوں نے کہی تو وہ نوجوان جو میز پر چڑھ کر اُن کو دھمکا رہے تھے وہ میز سے اُتر آئے اور نادم و شرمندہ ہوکر باہر نکل گئے۔

مجھے یہ بات اسی شام کو پتہ چلی تو میں نے ان سے جب اس کی تصدیق کرنا چاہی تو کہنے لگے "نہیں وہ میرے اپنے بچے تھے کوئی بات نہیں۔ ایسی بات ہوجاتی ہے"، تو گذارش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو اخلاقی جرأت اور ہمت اور حوصلہ اس انداز سے دیا تھا کہ وہ اپنے اصولوں کی خاطر۔ سچائی کی خاطر اور اس کام کی خاطر جس کو وہ جائز اور ضروری سمجھتے تھے وہ کسی سے دبنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور ان میں اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی اخلاقی کمزوری پیدا نہ کی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے دوسرے بھائی بندوں سے دبتے۔

حمید احمد خاں کی زندگی ایک ایسی مثال ہے کہ جو ہمارے نوجوانوں کے سامنے بیان کی جائے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس بیان کرنے سے بہرحال آج کی محفل میں، میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن یہ مناسب سمجھے تو سال بھر میں ایک دن اس کے لیے مختص کر دیں، تاکہ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی صفات نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے بیان کی جائیں۔ خاں صاحب مرحوم ہماری تعریف یا ہماری عقیدت کے محتاج نہیں۔ انھوں نے آسمانوں میں اپنا ایک مقام اپنے کردار سے پیدا کیا ہے۔ تمام زندگی میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس منزل کی تیاری کرتے رہے، جہاں وہ پرسوں پہنچے۔ اُن کا کردار، اُن کا اخلاق، اُن کے فعل اور اُن کے افکار تمام اس بات کے غماز تھے کہ ہر لحظہ اُن کو اس بات کا احساس تھا کہ اپنے خالقِ حقیقی کے سامنے پیش ہونا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اللہ اور رسول کے احکام کی پیروی کی۔ انسانوں کے حقوق پوری طرح سے ادا کیے۔ اپنے دوستوں سے محبت اور شفقت کا سلوک کیا اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہم اپنے ذہنوں میں اُن تمام ۳۵، ۴۰ سال کے واقعات کی یادیں اپنے سامنے لا کے بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن الفاظ میں یہ قدرت نہیں ہے کہ ہم اپنے جذبات کو پوری طرح سے بیان کر سکیں۔

میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُن کی اہلیہ محترمہ اور اُن کے بچوں کو ہمت اور صبر عطا کرے، اُن کو اس بات کا اطمینان ہونا چاہیے کہ اُن کے لیے اُن کے عزیز شوہر اور اُن کے والد کے لیے لوگوں کے دلوں میں اس قدر عزت و احترام کے جذبات ہیں جو کہ آج کل کے زمانے میں ویسے ہی مفقود ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے پاس اس وقت نہ کوئی طاقت تھی، نہ اختیارات تھے۔ لیکن یہ اُن کی ذاتی محبت اور شرافت تھی کہ آج ہزارہا آدمیوں نے اُن کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اور یہ انسان کی خوش قسمتی ہے کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ اس منزل پر پہنچے۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے اور ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

کوئٹہ
میں کتب و رسائل کا خوبصورت مرکز
گوشۂ ادب
متصل ریگل سینما۔ کوئٹہ۔ فون ۶۰۰۲ ۵۶۸۱

پروفیسر قاضی محمد اسلم

پروفیسر حمید احمد خاں

(چند یادیں چند باتیں)

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی ناگہانی وفات پر بہت کچھ لکھا گیا۔ اور کہا گیا ہے۔ لیکن ابھی اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اور لکھا جانا چاہیے۔ جو دوست اپنے اوقات کو خدمتِ قوم و ملک میں دیانت، لیاقت، اور محنت سے صرف کرتے ہیں۔ اُن کا ذکر قوم کو زندہ رکھتا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کا یہی مقام تھا اور یہی کام۔

نظم و نسق اور منصوبہ بندی میں دوستوں کے حقوق اور اُن کے اختلافات۔ (بعض اوقات نہایت تلخ اختلافات) کے متعلق فیصلہ کرنے میں مصروف رہتے ہوئے دفتری اوقات کی سختی سے پابندی کرتے ہوئے بڑے بڑے لوگ۔ اپنی نرم مزاجی اور آداب و اخلاق کو کھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن حمید احمد خاں کا یہ حال نہ تھا، جن اخلاق کو لے کر وہ دنیا میں آئے۔ جن کی پرورش دنیا میں رہ کر انھوں نے بہم کی۔ وہ آخری وقت تک اُن پر ہر حال میں قایم رہے۔ اُن کی مرکزی صفت شرافت تھی (جس سے وہ سب کا دل موہ لیتے تھے) ہاں انصاف کے تقاضے اُن میں تلخی بھی پیدا کرتے تھے، لیکن اُن کی اس تلخی میں بھی شرافت ہوتی تھی۔

دوسری بڑی صفت

دوسری صفت اُن میں اُستاد اور اُستاد کے پیشے کے لیے ایک گہرا اور ان مٹ احترام تھا۔ ایک دفعہ اُستادوں کی تنخواہوں اور اُن کے لیے عام مراعات اور سہولتوں کا ذکر آیا۔ تو پوری پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود اُن کا مؤقف یہ تھا کہ تنخواہیں بڑھیں یا نہ بڑھیں۔ مراعات ملیں یا نہ ملیں۔ وہ پھر بھی مدرسوں سے یہی کہیں گے کہ وہ اپنا کام کرتے جائیں اور کبھی بددل نہ ہوں اور حکومت سے ناراض نہ ہوں۔ کیونکہ ایک مدرس کا کام کچھ نرالی قسم کا ہے۔

یہ کام اتنا خوش گوار اور اتنا بلند ہے کہ اس کا اجر تو خود اس کے کام ہی سے مل جاتا ہے۔ ہاں استاد کو کام کرنے اور آمادہ رکھنے کے لیے ہر سامان معاشرے اور حکومت کو کرنا چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں، تو وہ ذمہ دار ہیں استاد کا کام پھر بھی یہ ہے کہ قربانی دے اور کام کرتا رہے۔

وائس چانسلر کا عہدہ تعلیمی دنیا میں بلند ترین عہدہ ہے۔ جب ایک مدرس اس عہدے پر پہنچ جائے، تو اس میں درس و تدریس کے چلن پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور افسروں والے اخلاق اور دفتری روایات کے اثر کے ماتحت نئے قسم کے اخلاق اور آداب اور طور طریقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن نہیں — یہ بات حمید احمد خاں میں نظر نہیں آتی۔

وہ استادوں، پرانے رفقائے کار اور علمی کام کرنے والوں کا اُسی طرح احترام کرتے رہے۔ اور ان کا وہی متوقع اور نارمل قسم کا احترام کرتے رہے، جو وہ خود استاد ہونے کی حیثیت سے اور پھر کالج کا پرنسپل ہونے کی حیثیت سے کرتے رہے اِس میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ اُستاد کی حوصلہ افزائی اور اس کی عزتِ نفس قایم کرنے کا اس سے بہتر کیا طریق ہو سکتا ہے۔

ایک اور کمزوری

استادوں اور علمی مذاق رکھنے والے اور علمی کام کرنے والے افسروں میں ایک اور کمزوری ہوتی ہے۔ یہ کہ وہ انتظامی کاموں اور فائلوں سے کراہت کرتے ہیں اور اپنے اس کام کو بکلّی دوسروں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور خود کو دوسروں کے کیے ہوئے کو منظور کرنے کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ لیکن حمید احمد خاں نے فائلوں پر ہمیشہ توجہ اور محنت کی نگاہ رکھی اور کیا رفتار کے لحاظ سے۔ کیا نگرانی کے لحاظ سے، کیا انصاف اور تعیینِ حقوق کے لحاظ سے اپنے کام کا معیار ہمیشہ اونچا رکھا۔

جب وہ وائس چانسلر بنے تو یہ خاکسار شعبۂ فلسفہ کا ہیڈ تھا۔ پہلا ہیڈ اور پروفیسر۔ قارئین جانتے ہیں کہ پاکستان میں فلسفہ کی تدریس میں اقبالیات کا ایک خاص مقام ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں منصوبہ بندی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور خیال ہوا۔ کہ جب تک کوئی معین اسکیمیں ترتیب نہ دی جائیں گی۔ اقبالیات کا حق ادا نہ ہوگا۔ اتفاق سے ایک امریکن پروفیسر سیاحت کرتے ہوئے انہی دنوں پاکستان پہنچے۔ ان سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ وہ کسی ادارے کی طرف سے بھیجے ہوئے نہ تھے۔ سیّاح تھے۔ اور انھیں مشرقی تحریکوں سے مشرقی شاعری اور مشرقی افکار سے خاص شغف تھا۔ اُن سے مشورے ہوئے۔ اور ان مشوروں کے نتیجہ میں کچھ ایسی اسکیمیں تیار ہوئیں۔ جن سے اقبالیات کو فروغ حاصل ہو سکتا تھا۔ خود پاکستان میں اور پاکستان سے باہر۔

اقبال کے اعزاز میں سالانہ لیکچروں کا سلسلہ شروع ہوا۔

چنانچہ پہلے لیکچروں کے لیے میاں ممتاز حسن کو منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد سے اقبال لیکچروں کا سلسلہ یونیورسٹی کے سالانہ فرائض میں داخل ہو گیا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا۔ کہ اقبال کے مشہور "خطباتِ مدارس" کے لیے حواشی تیار ہونے چاہئیں۔ جو خاص طور پر مغربی قارئین کے لیے مفید ہوں۔ ضروری حوالہ جات بھی لگائے جائیں۔ اور اس کتاب کو عام و خاص کے لیے مفید سے مفید تر بنا دیا جائے۔

یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اقبال کے منظوم کلام کا انگریزی ترجمہ نئے انتظام اور نئے اہتمام سے ہو۔ ٹھیک ہے اقبال کے منظوم کلام کے تراجم موجود ہیں۔ لیکن ضروری تھا کہ پاکستانی اہلِ قلم ۔۔ کلامِ اقبال کی روح کو جاننے والے اور انگریزی میں دستترس رکھنے والے اس میدان میں نکلیں۔ اچھے کلام کے اچھے تراجم کی کوئی حد نہیں۔ نئے تراجم کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے اور اب تک تو سوائے چند ایک کے بیشتر تراجم غیر مسلموں اور غیر پاکستانیوں کے کیے ہوئے تھے۔ ایک مجلسِ مشورہ میں یہ خاکسار بھی موجود تھا۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے ماہرانہ دانشمندانہ طریق سے بحث کو چلایا۔ نکلسن کے ترجمہ کی اغلاط کے باوجود اس کے اسلوب کو باقی تراجم سے بہتر قرار دیا گیا۔ اور فیصلہ ہوا کہ ترجمہ انگریزی نثر میں ہو۔ لیکن ایسی نثر میں جو نظم کا رنگ رکھتی ہو، اور جس میں روحِ کلام بہرحال مقدم ہے۔

افسوس یہ پراجیکٹ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے!

ایک باقاعدہ اور بامروّت انسان

پروفیسر حمید احمد خاں بامروّت انسان تھے۔ عدل سے اوپر سب سے احسان کا معاملہ کرنے کی تمنا رکھتے تھے۔ لیکن احسان کرکے بھی ممنونِ احسان کو محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ انھوں نے کسی کے لیے کچھ کیا ہے۔ کسی بات کا وعدہ کرلینا بس ایک ہی دفعہ کافی ہوتا تھا۔ یاددہانی کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اپنے وعدے نوٹ کرکے رکھتے تھے۔ اور وقت آنے پر اُن کو حتی الوسع پورا کردیتے تھے۔ اور کبھی جتاتے نہ تھے۔ جن کے حق میں وعدے ہوتے تھے وہ خود حیران رہ جاتے تھے کہ کس طرح اپنی زبان کی بات یاد رکھی اور وقت آنے پر پوری کردی۔

ایک نفسیاتی وصف

پروفیسر حمید احمد خاں کا ایک وصف نفسیاتی لحاظ سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور کئی دوسرے افسروں کے لیے مثال۔ وہ ہر ملاقاتی کی بات خوب توجہ سے سنتے۔ بات کسی کی ذاتی ہے۔ تعلیم کے کسی مسئلے کے متعلق۔ دین وملت، یا سیاست کے متعلق جسے انگریزی میں "گڈ لسنر" (GOOD LISTNER) کہتے ہیں۔ وہ اس کی مکمل مثال تھے۔ ملاقات کرنے والا تسلی پاتا اور وہ خود ذہنی، علمی، اخلاقی اور روحانی لحاظ سے اپنے آپ کو پہلے سے بلند تر مقام پر پاتے۔ اللہ اللہ یہ درویشی اور یہ سادگی اور ذوق اور یہ بے خودی!

میں یونیورسٹی سے فارغ ہوکر ربوہ کالج کا پرنسپل مقرر ہوا۔ ربوہ میں ایم۔ اے عربی کی کلاس کامیابی سے شروع ہوچکی تھی۔ اور اب کالج کا پلان یہ تھا کہ آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے سب سائنسوں اور سب آرٹس میں ایم ایس سی اور ایم۔ اے کی کلاسیں جاری ہوجائیں۔ میرے جانے پر فزکس ایم۔ ایس۔ سی کا مسئلہ یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد کے نوٹس میں آچکا تھا۔ اور ہوا یہ تھا۔ کہ یونیورسٹی کے ایک کمیشن نے رپورٹ یہ کردی تھی۔ کہ ربوہ میں ایم۔ ایس۔ سی کھولنے کا کوئی جواز نہیں۔۔۔ نہ اس وقت نہ آیندہ۔۔۔ کس وجہ سے؟۔۔۔ اس وجہ سے کہ:۔۔۔

— ربوہ میں زمین شورہ آلودہ ہے۔

— یہاں جو عمارت بنتی ہے چند سالوں میں بوسیدہ ہوجاتی ہے۔

— آبادی کم ہے۔ یعنی صرف ۱۴ ہزار کے قریب

— اعلیٰ تعلیم کا ماحول ہنوز ندارد

— تفریح کے سامان عنقا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ

میرے لیے بڑی مشکل تھی۔ کہ اب اس منجمد بلکہ مُردہ مسئلہ کو پھر سے کیسے زندہ کیا جائے۔ نظر پروفیسر حمید احمد خاں کی معقول پسندی پر پڑی۔ سب سے پہلے اُن کو اس بات کا قائل پایا کہ۔۔۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے سامان ۔۔۔ سارے کے سارے۔۔۔ لاہور ہی میں جمع نہ ہونے چاہئیں۔۔۔ بلکہ صوبہ کے اور مراکز میں بھی جہاں مناسب اور ممکن ہو۔۔۔

کھوے جائیں ــــ اس کے بعد اُن کو اس بات کا قائل پایا کہ ــــ

اگر ہم یونیورسٹی کی تمام معقول شرائط پوری کردیں تو ہمیں ایم۔ ایس۔ سی کا الحاق مل جائے گا ــــ چنانچہ طے پایا کہ ــــ یونیورسٹی ایک نیا کمیشن مقرر کرے۔ وہ موقع پر پہنچ کر تمام ضروری شرائط کی ایک فہرست مرتب کرے ــــ سامان کیسا ہو؟ ــــ کمرے کتنے ہوں؟ ــــ کتابوں کا ذخیرہ کیسا ہو؟ ــــ اسٹاف کس لیاقت کا اور کتنا ہو؟ ــــ کوئی تحریری گارنٹی یونیورسٹی کی طرف سے نہ مل سکتی تھی نہ ملی ــــ

بس زبانی شریفانہ قسم کا معاہدہ ہوا۔ جس روز ہم یونیورسٹی کی مرتب کردہ فہرست شرائط پوری کر چکیں تو یونیورسٹی کو اطلاع دے دیں۔ جس پر یونیورسٹی کمیشن پھر ربوہ آئے اور تسلی کرے کہ شرائط پوری ہوگئیں۔ یا قریبًا قریبًا پوری ہوگئیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہر مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوا۔ کسی ایک قدم پر بھی کوئی اُلجھن پیدا نہ ہوئی۔ نہ ہمیں لجاجت کرنی پڑی۔ نہ ہم پر کوئی احسان جتایا گیا۔ ایک کام جو معقول طور پر ہو جانا چاہیے تھا۔ شرائط پوری ہونے پر بغیر حیل و حجت ہو گیا۔ اور ربوہ میں ایم۔ ایس۔ سی فزکس جاری ہوگئی۔ اور اب وہ صوبے بھر میں ایک دیکھنے والا ادارہ ہے۔

لیکن کس انسان کی شفقت ــــ اور کس کی نظر کا نتیجہ؟ ــــ

حمید احمد خاں کی شفقت اور ــــ حمید احمد خاں کی نظر کا ــــ

یہ اُن کے بے شمار کاموں میں سے فقط ایک کام تھا۔ جسے انھوں نے اپنے فرائض منصبی میں سے ایک فرض سمجھ کر ادا کیا۔ ع

واہ رے زورِ شرافت خوب دکھلایا اثر

باتیں تو کئی لکھنے والی ہیں۔ لیکن کہاں تک لکھتے جائیں ــــ میں نے انھیں طلبہ سے ملتے اور باتیں کرتے بھی دیکھا۔ اس میں کوئی بناوٹ نہ ہوتی تھی۔ طلبہ سے شفقت اُن کا شیوہ تھا۔ لیکن اصول کی بات وہ کسی لحاظ، یا کسی طعنہ سے یا کسی کے دباؤ سے چھوڑنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ اور یہ مسلک اُن کا طلبہ کے تعلق ہی میں کام کرتا نظر نہ آتا تھا۔ بلکہ اپنے سے بالا حکام سے معاملہ کرتے وقت بھی اور اپنے برابر کا درجہ رکھنے والوں سے بھی اُن کا یہی طریق تھا ــــ

خدا مغفرت فرمائے۔ واقعی بہت سی خوبیاں تھیں حمید احمد خاں میں ــــ

عبید اللہ علیم کا
پہلا نمائندہ مجموعۂ کلام
چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں
شایع ہو گیا ــ بہترین گیٹ اپ ــ قیمت ۱۵ روپے
ناشر:ــ سیپ پبلی کیشنز ــ کراچی نمبر ۳

احمد ندیم قاسمی

پروفیسر حمید احمد خاں

تہذیبی قدروں کی زندہ علامت

پروفیسر حمید احمد خاں کی رحلت سے لاہور شرافت، شفقت، شائستگی اور ایمان داری کے ایک محبوب پیکر سے محروم ہوگیا ہے۔ وہ ایک مانے ہوئے ماہر تعلیم تھے۔ ایک محنتی استاد تھے اور ایک باوقار وائس چانسلر تھے، مگر ان کی ان سب اہم حیثیتوں پر بھی ان کی انسانیت بھاری تھی۔ وہ ان تمام تہذیبی اور مجلسی قدروں کی ایک زندہ علامت تھے جن کی توانائی سے آج کا معاشرہ محروم ہوتا جارہا ہے۔ اتنے بااصول استاد اور ایسے دردمند انسان آج کل نظروں سے ذرا کم ہی گزرتے ہیں۔ اس پر مستزاد ان کی حق گوئی اور بے باکی تھی جن کی وجہ سے قدم قدم پر انھیں مخالفتوں سے بھی سابقہ پڑا، مگر ان کی راست بازی اس معیار کی تھی جو کوئی ایسا سمجھوتہ نہیں کرسکتی جس سے راستی پر زد پڑتی ہو۔

پروفیسر حمید احمد خاں اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے علم و ادب اور سیاست سے یہ خطۂ ارض صدی پون صدی سے متاثر ہورہا ہے۔ آپ مولانا ظفر علی خاں مرحوم و مغفور کے چھوٹے بھائی تھے دوسرے دونوں بھائی بھی علم و ادب میں ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ پروفیسر محمود احمد خاں کے علمی تبحّر کا ایک زمانہ قائل ہے اور مولانا حامد علی خاں نے اردو ادب و فن کی جو بے شمار خدمات انجام دی ہیں، ان کے بھی ہم سب معترف ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے علمی، تحقیقی اور ادبی مشاغل ساری عمر جاری رکھے، مگر ان کا بیشتر وقت تعلیم و تعلم ہی میں گذرا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف کی تعداد بہت کم ہے۔ اب آخری عمر میں وہ اپنے منتشر مضامین کو یک جا کر رہے تھے اور اپنے محبوب موضوعات۔ غالب و اقبال۔ پر کتابیں لکھ رہے تھے۔ افسوس کہ ان کی اچانک موت سے یہ کتابیں نامکمل رہ گئیں۔ مگر ان نامکمل مسودات کو بھی شایع ہوجانا چاہیے، کیونکہ ان میں بھی تحقیق و تنقید کے ایسے ایسے جواہر پارے موجود ہوں گے جن سے آئندہ نسلوں کی رہنمائی ہوگی۔ دراصل پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم جس طرح بچے تلے انداز میں بولتے تھے، اسی طرح بچے تلے انداز میں لکھتے تھے۔ ان کے ہر جملے کا باقاعدہ ایک علمی پس منظر ہوتا تھا اور وہ اپنے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری قبول کرتے تھے۔ مرزا غالب کے حالات کے سلسلے میں انھوں نے جس انداز میں داد تحقیق دی، اس کے سلسلے میں ان کی لگن اور ریاضت کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ آج کل ان کا محبوب موضوع علامہ اقبال، ان کا فن اور ان کا فلسفہ تھا اور ان کے قریبی دوستوں کا کہنا ہے کہ علامہ پر انھوں نے جو کتاب شروع کر رکھی تھی وہ مکمل ہونے پر اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافے کا موجب بنتی۔ چنانچہ ہماری استدعا ہے کہ ان نامکمل مسودات کی اشاعت کا فوراً بندوبست ہونا چاہیے۔

اس طرح ان بے بدل تحریروں کو بھی بقائے دوام حاصل ہوگی اور ہمارے تہذیبی سرمائے میں بھی قابل قدر اضافہ ہوگا۔

مرحوم سے مجھے اتنا ذاتی قرب تو حاصل نہیں تھا کہ میں ان کے معمولات اور ان کے مزاج و کردار کی جزیات کے بارے میں اعتماد سے کچھ کہہ سکوں، مگر مجھ سے وہ ہمیشہ نہایت شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ اس زمانے میں انھیں کچھ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں لاہور کے اہلِ علم کی ایک کمیٹی کے اجلاسوں کی صدارت فرماتے تھے۔ مجھے بھی اس کمیٹی میں شمولیت کی عزت حاصل تھی، چنانچہ ان محفلوں میں جہاں مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر سید عبد اللہ، شیخ محمد اکرام، سید وزیر الحسن عابدی اور ڈاکٹر اجمل کے سے اہلِ علم کے مہذب معیارِ بحث سے مستفید ہونے کا موقع ملا، وہیں پروفیسر حمید احمد خاں (کہ اس مجلسِ یادگارِ غالب کے صدر تھے) کی گفتگو سنی اور اندازہ ہوا کہ انگریزی کے اس پروفیسر کو اردو زبان سے اور اردو زبان کے اتنے بڑے شاعر سے کتنی بے پناہ محبت اور عقیدت ہے۔ اس مجلسِ یادگارِ غالب نے صد سالہ برسی کی تقریب پر جو کچھ کیا، وہ پنجاب یونیورسٹی کی پوری تاریخ کا ایک قابلِ فخر واقعہ ہے۔ متعلقہ مطبوعات کا معیار اعلیٰ درجے کا ہے اور انھیں اتنی نفاست کے ساتھ مرتب اور طبع کیا گیا ہے کہ ہر کتاب پر پروفیسر حمید احمد خاں کی نفاستِ طبع اور شائستگی کی دل آویز مہر ثبت نظر آتی ہے۔ ابھی یہ کام تکمیل پذیر نہیں ہوا تھا کہ ملک کے سیاسی حالات کے تحت اور مرحوم کی اصول پسندی کے باعث انھیں یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ کو چھوڑنا پڑا۔ مگر ان کے بعد علامہ علاؤالدین صدیقی نے یہ منصب سنبھالا تو پروفیسر حمید احمد خاں کے کام کو جاری رکھنے کا عزم کر لیا۔ چنانچہ انہی کے دور میں غالب کی متعدد تصانیف اور اس کے متعلق یہ کتابیں چھپ کر تیار ہوئیں۔ ان کے بارے میں پروفیسر حمید احمد خاں کے یہ الفاظ بہت اہم مضمرات رکھتے ہیں کہ:۔

> "یہ کتابیں فروری ۱۹۶۹ء میں شایع ہو رہی ہیں۔ گویا ان کی تاریخِ اشاعت سے مرزا غالب کی حیات بعد ممات کی دوسری صدی شروع ہوتی ہے، مجلس کو یقین ہے کہ اس دوسری صدی میں غالب کے قبول عام کی سرحدیں کچھ اور وسیع ہو جائیں گی۔ خدا کرے کہ دنیا کو ہند اسلامی تمدن کے آخری ترجمان سے روشناس کرانے میں مجلس کی یہ سعی رائیگاں نہ جائے۔"

مجھے ایک اور واقعہ کبھی نہیں بھولے گا۔ یہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دن تھے۔ لاہور پر بھارتی ہوائی جہازوں کے حملے شروع ہو چکے تھے اور دن میں دس دس بیس بیس مرتبہ سائرن کی آوازیں گونجتی تھیں۔ ایک پُرجوش نوجوان کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس عالم میں انھوں نے اہلِ قلم کا ایک جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستانیوں کے عزم بالجزم کا دنیا کے سامنے اعلان کیا جائے۔ یہ مقصد نیک تھا۔ اس لیے میں بھی اس جلوس میں شرکت کرنے ناصر باغ پہنچ گیا۔ کچھ دیر میں پروفیسر حمید احمد خاں بھی پروفیسر سید وقار عظیم کی معیت میں تشریف لے آئے۔ پھر ڈاکٹر محمد باقر بھی آنکلے مگر خاصی دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی جب مزید اہلِ قلم تشریف نہ لا سکے، تو پروفیسر حمید احمد خاں نے تجویز پیش کی کہ یہیں ایک جلسہ کر کے اور ایک قرارداد منظور کر کے جلوس کے پروگرام کو ملتوی کرا دیا جائے۔ کیونکہ چار اہلِ قلم کا جلوس کچھ بھلا نہیں لگتا۔ سبھی نے اس تجویز کی تائید کی مگر جلوس کے منتظم کو شاید عزتِ نفس کا شدید احساس تھا۔ انھوں نے کہا کہ کم سے کم آپ چاروں اس جیپ پر سوار ہو کر فرلانگ دو فرلانگ تک تو چلیں کہ کچھ بھرم رہ جائے۔ ناچار ہم چاروں اس جیپ میں جا کھڑے ہوئے اور جیپ چلا دی گئی۔ آس پاس کے لوگوں نے یہ

منظر دیکھا تو ساتھ ہو لیے اور جی۔پی او تک اس ہجوم نے باقاعدہ ایک جلوس کی صورت اختیار کر لی۔ اُس روز پروفیسر حمید احمد خاں کا غصہ بھی دیدنی تھا اور بے بسی بھی۔ غصہ اس بات پر تھا کہ اہلِ قلم کیوں نہ پہنچے اور اگر نہ پہنچ سکے تو انھیں شارع قائد اعظم پر کیوں تماشا بنایا جا رہا ہے۔ اور بے بسی یہ کہ وہ چلتی جیپ سے چھلانگ نہیں لگا سکتے تھے۔ آخر سب نے طے کیا کہ او کھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر۔ جو تقریر کر سکتا ہے وہ تقریر کرے، اور جو نظم سنا سکتا ہے وہ نظم سنائے۔ چنانچہ پروفیسر حمید احمد خاں، سید وقار عظیم اور ڈاکٹر محمد باقر نے تقریریں کیں۔ میں نے نظم پڑھی، ادھر اُدھر ہجوم میں مجھے جو بھی شاعر دکھائی دیا، اُسے میں جیپ میں کھینچ لایا اور اسے نظم پڑھنا پڑی آخر مسجد شہدا کے چوک میں اس "جلوس" کو منتشر ہونے کی اجازت ملی۔ اور جب ہم لوگ خان صاحب یا وقار صاحب کی کار میں آکر بیٹھے تو خاں صاحب نے دعا مانگی کہ خدا نہ کرے ہمیں آیندہ اس طرح کے واقعے سے سابقہ پڑے۔ وہ تو خیر جو کچھ ہوا سو ہوا۔ مگر اس دوران کا وہ واقعہ ناقابلِ فراموش ہے جب جلوس نکلنے سے پہلے ایک صاحب نے کہا کہ جلوس کے دوران میں اگر ہوائی حملے کا سائرن بج اٹھا تو ہمارا طرزِ عمل کیا ہوگا۔ اس پر پروفیسر حمید احمد خاں گرجے۔ ہمارا طرزِ عمل یہ ہوگا کہ ہم جیپ میں کھڑے رہیں گے۔ چاہے ہمارے پرخچے ہی اڑ جائیں۔ جیپ سے کود کر کوئی پناہ ڈھونڈنا ان لوگوں کو نہیں سجتا جو اہلِ ملک کو آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا درس دینے نکلے ہیں ——!

ضروری اعلان

"مجلس یادگارِ حمید" نے پروفیسر حمید احمد خاں کے مکاتیب مرتب اور شایع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مرحوم کے عزیزوں اور دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ اس علمی و ادبی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اور اُن کے پاس مرحوم کے لکھے ہوئے جو خطوط ہوں اُنھیں بذریعہ رجسٹری مندرجہ ذیل پتے پر ارسال فرما کر اس کارِ خیر میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کریں۔

خطوں کے تصویری عکس لے کر اصل خطوط بحفاظت واپس بھیج دیے جائیں گے۔

منتظرِ کرم

سید وقار عظیم

۷۔ای۔ بلاک سی

سمن آباد —— لاہور

میرزا ادیب

میرے محترم استاد

پروفیسر حمید احمد خاں

آج صبح سے آندھی چل رہی ہے۔ اور مجھے ایک خیال بُری طرح ستا رہا ہے۔ آندھی یا تیز ہوا سے میں بالعموم پریشان نہیں ہوتا۔ ہوا تیز و تند ہو تو اس سے حرکت و عمل کا احساس ہوتا ہے، مگر میری آرزو یہ ہے کہ آج ہوا تھم تھم کر چلے، اس میں گرد و غبار بالکل نہ ہو۔ کچھ دیر کے بعد ہوا کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو جائے، اور کتنا ہی گرد و غبار کیوں نہ اڑنے لگے، مجھے کوئی فکر نہیں ہوگی، اس وقت تو لازماً فضا کو پر سکون ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ گھنٹے آدھے گھنٹے کے بعد ایک ایسے شخص کو وادیِ خاموشاں کی طرف اپنے سفر کا آغاز کرنا ہے، جس کی زندگی ہمیشہ بے داغ رہی ہے۔ اگر ایسے شخص کا کفن میلا ہو جائے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی، پروفیسر حمید احمد خاں نے کل ۲۲ مارچ کو دوپہر کے بعد اس دنیا میں آخری سانس لیا تھا اور آج ہم، جو ان کے شاگرد، احباب، عزیز ان کے نئے اور پرانے ساتھی ہیں انھیں آخری منزل پر پہنچانے کے لیے ان کی کوٹھی کے وسیع لان میں جمع ہو گئے ہیں۔

وہ میرے استاد تھے۔ ان کے ساتھ میری شاگردانہ عقیدت وابستہ ہے، لیکن کالج سے نکلنے کے بعد میرے اور ان کے درمیان استاد شاگرد کی بجائے دوستانہ روابط قائم ہو گئے تھے۔ جن میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا، ہم دوستوں کی طرح ملتے تھے۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ اس دوستی کی ابتدا بھی انہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ مجھے دور سے دیکھتے تھے۔ تو خود چل کر میرے پاس آ جاتے تھے۔ اور بے تکلفی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے۔ یہ محض ان کی محبت اور شفقت تھی۔ اور اس محبت و شفقت میں ان کا ہر شاگرد برابر کا حصہ دار تھا، کم از کم ان کے رویے سے یہی ثابت ہوتا تھا۔

مجھے پروفیسر حمید احمد خان کو قریب سے دیکھنے کا بارہا موقع ملا تھا۔ اور کئی بار ان کے دل و دماغ میں جھانکنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میرے استاد مجسمہ نفاست تھے، تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہوگا، اجلا لباس پہننا، صاف ستھری جگہ پر رہنا، گرد و پیش کے ماحول میں صفائی رکھنا، یہ نفاست پسندی ضرور ہے، مگر بڑی محدود قسم کی میرے محترم استاد میں تو نفاست پسندی کے بے شمار روپ تھے، اور واقعہ یہ ہے، کہ انھیں نفاست پسندی کا ہر روپ بے حد عزیز تھا۔

اس قدر عزیز تھا کہ وہ اسے کسی حالت میں بھی مجروح صورت میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی نفاست پسندی کا یہ عالم ہے کہ مرنے سے کچھ روز پیشتر وصیت کرتے ہیں کہ ان کے جسدِ خاکی کو گلبرگ کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ کیونکہ وہ

صاف ستھرا ہے۔ نفاست کو معنویت کی وسیع تر سطح پر لاکر دیکھیں تو یہ عبارت ہے زندگی کی اُجلی اور داغ دھبے سے پاک اور منزہ قدروں سے۔ یہ نظام اقدار پر مشتمل ہے۔ خلوص، راست بازی، راست گوئی، سلیقہ مندی، بے ریا محبت، نیک نیتی، نیک نفسی اور باہمی اعتماد پر۔ کہتے ہیں کہ آرٹ سے زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ مجھے اس نظریے کے تسلیم کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ انسان زیادہ قابلِ احترام ہے، جو آرٹ سے زندگی میں حسن پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی ہی کو آرٹ بنا دیتا ہے، اور پروفیسر حمید احمد خان کی زندگی واقعی ایک آرٹ ہے۔ وہ سلیقہ مندی سے زندگی بسر کرنا جانتے تھے، اور انھوں نے یہ ستر برس جو اس دنیا میں گذارے ہیں، آرٹ کی تمام پابندیوں پر عمل پیرا ہو کر گذارے ہیں، اُن کے اس آرٹ کا کمال یہ ہے کہ وقت کا جو لمحہ بھی ان کی زندگی کا جزو بنتا تھا، جب ان سے الگ ہوتا تھا تو ان کے سانس کی عطر فشانی سے نسیم بہار کا جھونکا بن جاتا تھا۔ ایسے لوگ خوشبوئیں پھیلاتے ہوئے آتے ہیں اور خوشبوئیں پھیلاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

ان کی نفاست پسندی کو اگر کسی مثال کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کروں تو یوں کہہ سکتا ہوں، کہ زندگی کے خوبصورت قالین پر چلتے ہوئے اگر ان کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا تو انھیں پاؤں پر زخم لگنے کا افسوس ہرگز نہ ہوتا۔ افسوس ہوتا تو فقط اس بات کا کہ اس زخم سے نکلے ہوئے لہو کے قطروں نے قالین کی نفاست تباہ کر دی ہے۔

وہ سر سے پاؤں تک نفاست تھے۔ نفاست میں نرمی اور ملائمت ہوتی ہے۔ مگر کبھی کبھی وہ نرم اور ملائم نہیں ہوتے تھے۔ دیکھنے والے محسوس کرتے تھے کہ وہ سخت ہو گئے ہیں۔ ان کا رویہ کرخت ہو گیا ہے۔ لیکن یہ بالکل عارضی کیفیت ہوتی تھی۔ برف کے تودے پر ہاتھ رکھیں تو وہ کتنا کرخت معلوم ہوتا ہے۔ مگر کچھ لمحوں کے بعد ہی وہ پگھل کر پانی بن جاتا ہے۔ یہی کیفیت پروفیسر حمید احمد خاں کی بھی تھی۔ وہ جتنی جلدی گرمی گفتار کا اظہار کرتے تھے اتنی جلدی ملائمت بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ان کے اندر "کرختگی" تھی ہی نہیں، ان کے باطن میں پنکھڑیوں کی سی لطافت اور شبنم کی سی معصومیت تھی۔ کسی کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آتے تھے تو تھوڑی دیر بعد ہی انھیں احساس ہو جاتا تھا کہ ان کی زندگی کے صاف ستھرے دامن پر ایک داغ سا پڑ گیا ہے۔ اور یہ داغ ان کی طبع نفاست پسند کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ گرمی کلام ایک دم ختم ہو کر نرمیٔ گفتار بن جاتی تھی! جس سے الجھتے تھے اس سے بعض اوقات معافی مانگ لیتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ ہماری کلاس میں انگریزی کمپوزیشن سکھانے آئے تھے تو طلبہ نے اُن کے ساتھ اسی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا، جو وہ ہر نئے پروفیسر کے ساتھ پوری باقاعدگی سے روا رکھتے تھے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا تھا۔ انھوں نے لڑکوں کو مخاطب کر کے خوب ڈانٹ پلائی تھی۔ مگر جب لڑکوں نے خاموشی اختیار کر لی تو ان کے وطیرے میں ایک ایسی تبدیلی آگئی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اپنی تلخ گوئی پر دکھ ہے۔ اور وہ اس احساس کو ختم کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ کوئی، سخت گیر استاد نہیں۔

ٹیوٹوریل میٹنگ میں وہ میری نظمیں سنتے تھے اور میری ہر طرح ہمت افزائی کرتے تھے۔ ایک بار بھی انھوں نے نہ بتایا کہ وہ علم و ادب کے ایک مشہور خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، اور خود بھی بہت اچھے افسانہ نگار تھے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں اس زمانے میں نظمیں لکھتا تھا اور پروفیسر حمید احمد خاں افسانے۔ اس دور میں

انھوں نے ایک نہایت خوبصورت افسانہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "مصور" اور یہ افسانہ "ہمایوں" میں چھپا تھا کسی کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی۔ کہ اس افسانے کے مصنف وہی حمید احمد خاں ہیں جو ایف اے کی ایک کلاس کو انگریزی کمپوزیشن سکھاتے ہیں۔ کافی مدت بعد مجھے اس حقیقت کا علم ہوگیا، میں نے جب ان سے 'مصور' کا ذکر کیا تھا، تو انھوں نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر یوں نفی میں سر ہلا دیا تھا جیسے یہ افسانہ انھیں پسند نہیں، اور وہ اس تصنیف سے دست بردار ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ کونسی نفاست خیالی تھی جس سے ان کا یہ افسانہ محروم تھا؟ اس کا کبھی انھوں نے ذکر نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ لوگ اسے یک سر فراموش کردیں۔ پروفیسر حمید احمد خان کی نفاست ان کے خونناب جگر کی کشید گاہ میں پرورش اور ترتیب پاتی تھی۔ غالبیات سے متعلق کوئی 'مقالہ' اور غزل کے ارتقائی مراحل پر مبنی کوئی مضمون ہو، دیوان غالب کے نسخۂ حمیدیہ کا دیباچہ ہو یا خواجہ الطاف حسین حالی کے حیات و کلام کا جائزہ ہو، وہ ہر جگہ ہر مقام پر اسی خونِ جگر سے آمیز کی ہوئی نفاست سے کام لیتے تھے۔ انھوں نے بہت کم لکھا ہے، مگر جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے نفاست کے مقررہ معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے، ان کی ساری تخلیقات ضخیم جلدوں سے دامن کشا چند سو صفحات میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ مگر یہی چند سو صفحات ادب کے افق پر چاندنی کا روپ دھارے بڑی نفاست سے بچی ہوئی ہیں۔

نفاست ان کی پوری زندگی پر حاوی ہوگئی تھی۔ یہ ہر کام میں باقاعدگی، یہ خود کو ہر وقت چست و چوبند رکھنے کی پابندی اسی نفاست پسندی کے مظاہر تھے اور یہ بھی نفاست ہی کا ایک رخ تھا کہ وہ طے شدہ پروگرام میں ایک منٹ کی بے قاعدگی، بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی کو اپنے دفتر میں یا گھر میں پانچ بجے ملنے کے لیے کہا ہو تو آنے والے کو لازمی طور پر اس وقت ان کے پاس آنا چاہیے، جب گھڑی کی گھنٹے کی سوئی پانچ کے ہندسے پر پہنچ جائے۔ اس میں ایک لمحے کی کمی بیشی بھی انھیں ناگوار ہوگی، یہ الگ مسئلہ ہے کہ دیر سے آنے والے کی پذیرائی بھی کر دیتے تھے۔ گو شکن آلود پیشانی کے ساتھ۔!

تو یہ ہیں پروفیسر حمید احمد خاں، میرے محترم میرے شفیق استاد، جنھوں نے نفاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ جنھوں نے نفاست کو گہری معنویت بخشی تھی۔ اور جو آج دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہے ہیں۔ اور مجھے فکر ہے کہ گرد آلود ہوا ان کا کفن میلا نہ کردے! کوئی اس آندھی کو روک نہیں سکتا۔ کون روکے گا۔

ایک جاپانی شاعر تھا جس نے کہا تھا۔

باغ کے تختے پر لکھا ہے کہ پھول مت توڑو
مگر ہوا یہ بات نہیں پڑھ سکتی۔۔۔۔

اور آندھی کو کون سمجھائے کہ تو اس شخص کا کفن میلا نہ کر، اس کی زندگی سراپا نفاست تھی۔

کاش آندھی یہ بات سمجھ سکے۔

افکار ـــــ سالانہ ممبر بن کر "ندیم نمبر" رعایتی قیمت میں حاصل کیجیے

جمیل الدین عالی

پروفیسر حمید احمد خاں کی یادیں

پروفیسر حمید احمد خاں بھی رخصت ہوئے۔

آخر یہ کیا قصہ ہے۔ آج کل موت کا غلغلہ زیادہ ہے۔ زندگی کی آواز کم سنائی دیتی ہے۔ شاید ہم خود زندگی سے دور اور موت سے قریب ہو رہے ہیں۔ اب ہمارا سفرنامہ کتابی صورت میں نہ آئے، دوسرا مجموعہ کلام شایع نہ ہو تو کیا یہ موت کی ذمہ داری ہے۔ زندگی انتظار کر لیتی ہوگی موت نہیں کرتی، کہتے ہیں کہ وہ سخت پنکچوئل ہوتی ہے۔

یا ایسے احساسات اس نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ ہیں جو ایسی سوچیں پیدا کر دیتی ہیں۔ سچ کہ انسان میں قوت مقابلہ ہونی چاہیے، مگر کہاں تک۔ خاص طور پر جذباتی رشتوں کے معاملے میں تو قوت مقابلہ کا نعرہ بہت جلد کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ بہت بنے۔ بہت صبر وضبط دکھائے، بہت اترائے تو آدمی سنکی نظر آنے لگتا ہے۔ آج کل ہم کچھ ایسی ہی آزمایش سے گذر رہے ہیں۔ ہمارا ایک نہایت محبوب دوست ہسپتال میں داخل ہے۔ اللہ اسے اچھا کرے۔ لڑکپن کا یار عباس احمد عباسی مر گیا، تو ہم نے صبر وضبط کا فراڈ اختیار کیا۔ وہ مشہور صحافی اور کثیر الاحباب آدمی تھا، اس لیے اس پر تعزیتی تحریریں چھپیں۔ ہم فوری طور پر تو کچھ لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ چند روز بعد بھی اپنے اس کالم میں اس کا ذکر کرنا چاہا تو سیدھے سادے ماتم کی بجائے فلسفیانہ تنازعات میں دھنس گئے۔ دوسرے دن چھپا ہوا کالم دیکھا تو اپنے آپ پر افسوس ہوا۔ نہ اپنا جی ہلکا کر سکے۔ نہ کوئی، اور قاعدے کی بات کہہ سکے۔ ہاں اس وقت عباس کی موت پر ہم نے جو شہرت اور ابدیت کے مفروضات کا بھانڈا پھوڑنا شروع کر دیا تھا تو اس کی ایک وجہ بھی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ گلڈ میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا تھا، اس میں محترم سید محمد تقی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے ہمارے لیے ایک رنج دہ بات کہہ دی تھی۔ یہ کہ عباس کی تحریریں اعلیٰ معیار کے مطابق نہیں ہو سکی تھیں جبکہ وہ بہت بہتر لکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ دراصل تقی صاحب اپنی طرف سے اپنی نقادانہ دیانت محفوظ رکھتے ہوئے ایک مرے ہوئے دوست ادیب کے بارے میں تعریفی گفتگو کی رسم پوری کر رہے تھے۔ ایسے جلسوں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور ذاتی طور پر ہم ان کے ممنون تھے کہ ہم اپنے چونتیس سال کے دوست سے متعلق کچھ سن ہی رہے ہیں۔ تقی صاحب کی رائے بھی درست تھی۔ کیونکہ عباس کی اہلیتیں واقعی اس کے پروڈکشن سے کہیں زیادہ تھیں!!!

لیکن یہیں سے ہمیں یہ خیال آیا کہ پروڈکشن کیا ہوتا ہے۔ پروڈکشن کی عمر۔ اس کی کوالٹی۔ اس کی پائیداری اس کی عارضیت یا ابدیت کا مسئلہ ہے کیا۔ ابھی تہذیب انسانی پر چھ سات ہزار سال سے زیادہ تو گزرے نہیں اور لوگوں نے اپنی

تسلّی کے لیے عظمتوں کے لافانیت کے وابدیت کے سکّے گھڑ گھڑ کر رائج بھی کرا دیے۔ کچھ یوں بھی محسوس ہوا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ تعزیتی جلسے میں تنقیدی گفتگو ہونے لگے۔ حالانکہ تقی صاحب کی گفتگو بنیادی طور سے محبّتانہ تھی، مگر بس وہ ایک پھانس ہمارے دل میں لگ گئی۔ وہاں ہم نہ بولے کہ اس وقت جذباتی کیفیت چند فقروں کی متحمّل بھی نہ تھی۔ تیسرے دن مضمون لکھنے بیٹھے تو ردّعمل نے کچھ اور رخ اختیار کر لیا تھا۔

اب ایک پرانی صداقت اپنی اہمیت یاد دلاتی ہے۔ رنج کرنا ہے تو رنج کی طرح کرو۔ یا تو سچے دل سے یہ کہو اور سمجھو کہ اللہ جو تیری مرضی۔ بلکہ بعض مضبوط ایمان والے تو موتوں پر الحمدللہ کہتے ہیں۔ لیکن اگر تمھارا مقام اتنا اونچا نہیں تو اپنے طبعی اظہار کو صبر وضبط اور فلسفہ طرازی کا پابند نہ کرو۔ روؤ۔ چینخو۔ چلاّؤ۔ جو لمحہ جس طرح گذرا ہو اسے کسی اور بات سے ملوّث کیے بغیر گذرنے دو۔ ہاں بعض صورتوں میں بقول جگر مرحوم یوں بھی ہوتا ہے۔ ع

کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

تو ہم عارضی۔ دوامی شہرت اور انسانوں کی ابدیت کا مسئلہ پھر کسی موقعے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ ہم نے اس پر سوچا ہے اور ہم اس پر کچھ عرض بھی کریں گے کہ یہ ایک فکر انگیز موضوع ہے۔ مگر ابھی نہیں۔ جس بات کی فوری تحریک کسی ردعمل سے ہو ممکن ہے کہ عجلت اظہار اس پر گفتگو کو خالص اور مضبوط نہ رہنے دے۔

رہا عباس مرحوم تو ہم اب بھی اس پر مضمون نہیں لکھ سکتے۔ اغلب یہ ہے کہ کوئی تیسرا دوست ہم دونوں پر لکھے گا۔

سماجی سطح پر دیکھیے تو پروفیسر حمید احمد خاں کا انتقال ایک قومی سانحے سے کم نہیں ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں انگریزی کے استاد اور اردو کے سپاہی تھے۔ ہم ان کے شاگرد نہیں رہے۔ لیکن تمام عمر انھیں استاد جانا۔ وہ لاہور میں رہتے تھے اور ہم کراچی میں۔ ملاقاتیں زیادہ تر باضابطہ مجلسوں تک محدود رہیں، مثلاً گلڈ کی مجلسیں۔ مثلاً مرکزی اردو بورڈ لاہور۔ اردو ترقی بورڈ کراچی۔ انجمن ترقی اردو کچھ ذیلی کمیٹیوں میں ساتھ کام کیا۔ کچھ مشاورتی کمیٹیوں میں ان سے فیضیاب ہوئے نجی ملاقاتیں رہیں، مگر زیادہ نہیں، انھیں پورے طور پر جاننے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے، مگر جتنا جانا اس کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک بڑے آدمی اور خالص پاکستانی المزاج پاکستانی تھے۔

ہمیں خود اچھی اردو بولنے یا لکھنے کا دعویٰ نہیں رہا۔ بلکہ سچ بات یہ ہے کہ ہمارا اپنا مکتبِ فکر کچھ اور رہا ہے۔ ہم زبان کے معاملے میں محاورہ بازی۔ جگت تذکیر و تانیث وغیرہ کے مسائل کو بالکل اہمیت نہیں دیتے۔ فقروں کی تراش خراش، زیبائش غرضیکہ انشائیت کی کوئی خاص تکریم نہیں کرتے۔ زبان کے معاملے کسی سابق یا حالیہ صوبے شہر۔ مکتب کے تفوق یا "درجہ استناد" کے بھی قائل نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ اردو پڑھانے والوں اور مبتدیوں کا مسئلہ ہے۔ ہماری رائے میں تاریخی واقفیت سے آگے جا کر ان پر زور دینا مشیخت اور اجارہ دارانہ ذہنیت کی باتیں اور سائنسی زبان میں زبان کے لیے مانع ارتقا ہیں۔ ہماری رائے ہمیشہ سے یہ رہی ہے اور کبھی ہماری کوئی تحریر اس رائے کے خلاف غمازی نہیں کر سکتی کہ زبان ہر اس شخص کی ہے جو اسے استعمال کرے۔ یعنی ہر بولنے والا اہلِ زبان ہے۔ اگر انگریزی آکسفرڈ اور کیمرج کے محاوراتی اور تلفظاتی اجارے میں رہتی تو آج امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور دوسرے بہت سے ممالک کی مجموعی جینئس سے مالا مال نہ ہوتی۔ سنسکرت کی طرح سوکھ کر یادِ ماضی ہو چکی۔ مگر یہ ایک بحث ہے اور بڑی سخت بحث، اس وقت

کہنا یہ تھا کہ ہماری بیدائے تو اپنی جگہ مگر ہم نے بڑے بڑے مستند اہلِ زبان کو بھی سُن رکھا ہے۔ اپنے گئے گذرے زمانے میں بھی دلّی کے چار استادوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ بیخودؔ صاحب۔ سائلؔ صاحب۔ پنڈت امرناتھ ساحرؔ صاحب اور پنڈت تربھون ناتھ زارؔ صاحب۔ یہ تو تھے شاعر اساتذہ۔ نثر نگاروں میں ایک ہی نام بہتوں پر بھاری ہے۔ یعنی ہم نے خواجہ حسن نظامی صاحب کو خوب دیکھا اور سنا ہے۔ ویسے اور بہت سے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ دلّی مرتے مرتے بھی دلّی تھی۔ لکھنؤ ہم کبھی گئے نہیں۔ مگر اس زمانے کے دستور میں دلی والوں کو لکھنؤ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

اور ہم نے سر عبدالقادر مرحوم کو دیکھا اور سنا ہے۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام سے گفتگو کی ہے اور کسی حد تک مولانا مہر اور میاں بشیر احمد کی باتیں بھی سنی ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر کے حلقے میں حاضری دی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اب بھی ہمارے لیے چشمۂ فیض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پس منظر کے بعد ہم بڑی آسانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر حمید احمد خاں کی زبان میں تمام پرانی لطافتیں اور تمام جدید توانائیاں موجود تھیں۔ ان کی گفتگو میں وہ سب کچھ جھلکتا تھا جو ہم نے بزرگوں میں دیکھا اور وہ سب کچھ بھی جو ایک زندہ اور پھیلتی ہوئی زبان کا خاصّہ ہونا چاہیے۔ واللہ کہ زبان میں وہ ہم دلّی والوں سے کہیں آگے تھے۔

ایک عجیب خصوصیت ان کی زبان میں ایسی تھی جو انہی کے بہت سے ہم عمر فضلا میں بھی کم دیکھی۔ وہ اردو میں کبھی انگریزی کے الفاظ یا فقرے استعمال نہیں کرتے تھے۔ اصطلاحوں کی بات اور ہے کہ ابھی اردو میں بے شمار اصطلاحات کے ترجمے زبان پر نہیں آئے۔ سو کبھی کبھار جہاں اصطلاح کی ضرورت ہی آپڑے، وہ انگریزی یا لاطینی کا لفظ استعمال کر لیتے تھے۔ مگر وہ بھی متوازی تشریح کے ساتھ۔ لیکن عام ادائے مطالب میں جس طرح ہم جیسے ہر چند ثانیوں میں دو تین لفظ بلکہ فقرے کے فقرے انگریزی کے اڑا دیتے ہیں (اور وہ بھی غلط سلط) اس سے وہ مبرّا تھے۔ اور اس طرح کہ انھیں اور سننے والوں کو کوئی تکلف بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ان کا تلفظ۔ ان کا لہجہ، ان کا اندازِ اظہار، ایک ایسے شگفتہ طبیعت، حاضر دماغ، جدّت پسند عالم جیسا تھا، جسے زبان پر مکمل عبور حاصل ہو۔

اور وہ چالیس برس سے انگریزی پڑھا رہے تھے۔

اردو سے ان کے شغف کا یہ عالم تھا کہ ہم ان سے بہت ہی نیاز مندانہ رابطہ رکھنے کے باوجود ان کی کرم نوازیوں کی بنا پر۔ گستاخی اختیار کرتے ہوئے انھیں اردو کا شدّت پسند کہا کرتے تھے۔ وہ ہمارا مذاق برداشت کر لیتے تھے مگر کبھی کبھی ایک آہ ان کے لبوں پر آتی اور کہتے ہاں بھائی، ہر اہلِ عقیدہ کو شدّت پسند ہی کہا جاتا ہے۔ حضرت اگر آپ اپنے عقیدے کو سچا سمجھتے ہیں تو یہ شدّت پسندی ہی ہوئی نا۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہی ہو سکتی ہے۔

ہمیں پروفیسر حمید احمد خاں کے سیاسی عقاید نہیں معلوم۔ ظاہر ہے کہ ایک سرکاری قسم کے ملازم رہے تھے۔ سیاسی عقیدے کا کھلا اظہار برملا کرتے بھی کیونکر۔ لیکن ہم نے محسوس کیا کہ ان کی زندگی میں پرانی وضع داری کے باوجود ان کے مزاج میں مثبت اور روز افزوں جدیدیت تھی۔ اپنے بیشتر ہم عصروں کی طرح وہ نئے خیالوں کو سرسری طور سے ڈسمس نہیں کر دیتے تھے۔ بات سنتے تھے اس پر سوچتے تھے اور جی کو لگے تو اپنی رائے کو وقار کا مسئلہ بنائے بغیر بول دیتے تھے۔

غالب اور اقبال سبھی "شوقینوں" کے محبوب موضوعات ہیں۔ مگر پروفیسر صاحب کی غالب شناسی اور اقبال پرستی بجائے

خود ایک تاج محل کی طرح چمکتی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ غالب واقبال کے انتخاب اور برمحل استعمال کی ایک نئی روایت تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس روایت کا فیض بہت دور تک نہ پہنچا ہو اور ان کے شناسا مداحوں تک محدود ہوں۔

لیکن انھوں نے غالب واقبال پر بہت کچھ لکھوانے کے علاوہ بہت کچھ خود بھی لکھا۔ غالب کی زندگی پر بھی انھوں نے خاصا کام کیا تھا۔ غالب واقبال پر کبھی کبھی اپنے مسودات کے کچھ حصے سناتے رہتے تھے۔ افسوس کہ تاحال وہ کتابیں چھپنے کی خبر نہیں آئی۔

جس حد تک ہم نے انھیں دیکھا وہ سخت صلح جو اور محبت پسند بزرگ تھے۔ دو تین معاملاتی مجلسوں میں چند بڑے نام والے بزرگ آپس میں گتھ گئے۔ واک آؤٹ کی نوبت آگئی۔ پروفیسر صاحب صدر نشین تھے۔ انھوں نے عرض ونیاز سے کام نکلتے نہ پایا تو گرز محبت سنبھالا۔ کہا واللہ آپ لوگوں نے یہ حرکت کی تو میں استعفیٰ بھی دوں گا اور بھوک ہڑتال بھی کروں گا۔ وہ بزرگ حضرات گلے مل لیے۔ پروفیسر صاحب کی آنکھیں بھی ان کی باتوں کی طرح میٹھی تھیں۔ کڑوے سے کڑوا مناقشہ پگھل کر شہد ہو جاتا تھا۔

پروفیسر صاحب سے ہماری خصوصی نیازمندی کا آغاز جناب ممتاز حسن کی معرفت ہوا تھا۔ عجیب المیہ ہے کہ ہم ایک شہر میں رہتے ہیں اور ہفتوں مہینوں نہیں مل پاتے، جیسی محبت ہم نے ان دو صاحبوں میں پائی، ہمارے ہم عصروں میں نہیں دیکھی جاتی۔ شاید پروفیسر صاحب مرحوم اور جناب ممتاز حسن صاحب ہم مکتب بھی ہوں، مگر ان کی عمر دوستی ہم مذاقی سے طویل اور محکم رہی۔ علم کی جستجو۔ اہلِ علم واہلِ ادب کی منزلت۔ طالبانِ علم کی ممکنہ خدمت اپنے بارے میں انکسار اور معاملات ومسائل کو صوبائیت کی عینک سے نہ دیکھنا۔ یہ خصوصیات ان بزرگوں میں مشترک پائیں۔ اور ان خوبیوں کے ورثہ دار کم از کم کراچی شہر میں تو کم ہی نظر آئے ہیں۔

زندہ ملکوں میں قاعدہ ہے کہ جن لوگوں نے علم وادب کی شاندار خدمات انجام دی ہوں ان کی زندگی میں ہی ایک PRESENTATION VOLUME شایع کی جاتی ہے۔ ایک خاصی ضخیم کتاب جس میں نہ صرف ممدوح کی حیات اور کاموں کا تذکرہ ہوتا ہے بلکہ ان موضوعات پر اعلیٰ درجے کے مضامین شامل ہوتے ہیں جن موضوعات سے ممدوح کو خاص دلچسپی رہی ہو۔ پاکستان میں صرف جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان کو ایک PRESENTATION VOLUME پیش ہوئی مگر اس وقت جب وہ برسرِ اقتدار تھے خیر وہ بھی ایک مبارک فال تھی۔ باقی ہم لوگ زیادہ سے زیادہ ادبی رسائل کے نمبر پر اکتفا کرتے تھے۔ وہ سلسلہ بھی بند ہو گیا تھا۔ ہماری تحریک پر[1] "افکار" کراچی نے حفیظ نمبر، جوش نمبر اور فیض نمبر نکالے اور مدیر "افکار" کی محنت میں کلام نہیں لیکن پھر۔ ہ بھی دل برداشتہ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ اب ان میں پھر ہمت آئی ہے اور احمد ندیم قاسمی نمبر نکال رہے ہیں۔ یہ سلسلہ مبارک ہے مگر بہر حال تخلیقی ادیبوں کا ہے جنھیں لوگ یوں بھی زیادہ جانتے ہیں۔ ایک PRESENTATION VOLUME جناب ممتاز حسن کے لیے شروع ہوئی تھی۔ جب وہ اقتدار سے الگ ہوئے وہ منصوبہ بند بھی غائب ہو گئے۔

اور پروفیسر حمید احمد خاں جیسی شخصیت پر صرف کالم لکھے جا رہے ہیں۔

---

[1] افکار کا حفیظ جالندھری نمبر جناب جمیل الدین عالی کی تحریک اور گلڈ کے تعاون سے راقم الحروف نے شایع کیا تھا اور بس! (صہبا)

انتظار حسین

غالب، گھڑی، اقبال اور پاکستان

غالب، پاکستان، اقبال، اردو زبان، ان چار چیزوں کی آمیزش سے جو خمیر اٹھا، اس سے پروفیسر حمید احمد خاں بنے۔ باقی ایک چیز گھڑی تھی جس نے ان کی زندگی میں بہت عمل دخل پیدا کر لیا تھا۔ جلسہ گاہ میں ایسے داخل ہوتے تھے، جیسے ڈپٹی نذیر احمد دلی کی لائبریری میں داخل ہوتے تھے۔ روزانہ کا یہ معمول تھا کہ ادھر گھنٹہ گھر کے گھڑیال نے ٹن ٹن چھ بجائے اور ادھر ڈپٹی نذیر احمد لائبریری داخل ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ڈپٹی نذیر احمد لائبریری میں داخل ہو گئے۔ مگر گھڑیال نہ بولا۔ گھنٹہ گھر والے اس پر پریشان ہوئے اور جھٹ پٹ اپنی گھڑی کو درست کیا۔ اور حلقہ ارباب ذوق کا جلسہ اس روز ۴ بجے سہ پہر کو شروع ہونا تھا۔ اور پروفیسر حمید احمد خاں کو صدارت کرنی تھی۔ حلقہ کے ادیبوں نے چار بجے کو کب چار بجے سمجھا تھا کہ آج ہی سمجھتے۔ خاں صاحب نہ ایک سیکنڈ ادھر نہ ایک سیکنڈ اُدھر، ٹھیک چار بجے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے بورڈ روم میں داخل ہوئے۔ کمرے میں آدمی نہ آدم زاد۔ انھوں نے گھڑی کلائی سے کھول کر سامنے میز پر رکھی۔ یوں سمجھیے کہ تلوار نیام سے نکال کر روبرو رکھی۔ پھر حلقہ کا جو منتظم آیا اُس نے خاں صاحب کی گھڑی کو مثال شمشیر برہنہ میز پر رکھے دیکھا۔ خاں صاحب کے تیور دیکھے اور سہم کر رہ گیا۔

ویسے خاں صاحب کے تیوروں کا معاملہ یہ تھا کہ اوپر سے سخت اندر سے نرم، شہرت بخاری حلقہ ارباب ذوق ادبی کے جلسہ میں بتا رہے تھے کہ خاں صاحب عید کے بعد اسلامیہ کالج میں آکر چپراسیوں کے کوارٹروں پر پہنچتے، عید ملتے اور عیدی دے کر آتے۔ ایک برس ایک چپراسی بیمار ہو کر گاؤں چلا گیا۔ خاں صاحب نے اس کا پتہ معلوم کیا۔ دو سو روپے کی عیدی اسے وہاں بھیجی، ویسے تو اسلامیہ کالج چھوڑے ہوئے خاں صاحب کو مدت ہی ہو گئی تھی۔ مگر چپراسیوں کے ساتھ ان کی وضعداری چلے جا رہی تھی۔

یونس جاوید نے مجلس ترقی ادب کے خاکروب کے ساتھ ان کی وضعداری کا قصہ سنایا۔ علامہ اقبال کے جشن پیدائش کا جلسہ جب بخیر و خوبی ہو چکا تو طے ہوا کہ سب عملہ والے مل کر چائے پئیں۔ عملہ کے سب اراکین موجود تھے۔ مگر خاں صاحب کی آنکھیں مجلس کے خاکروب کو تلاش کر رہی تھیں۔ اسے بطور خاص بلوایا۔ کہا بھائی تم عیسائی ہونے کی وجہ سے ہمارے ساتھ چائے پینا پسند نہ کرو تو الگ بات ہے، مگر ہمیں تمھارے ساتھ چائے پی کر بہت خوشی ہوگی۔

علامہ اقبال کے جشنِ پیدائش کا ذکر آیا ہے تو یہ سن لیجیے کہ خاں صاحب اُٹھتے بیٹھتے دو شاعروں کا وظیفہ پڑھتے تھے غالب کا اور اقبال کا۔ ایک وقت تھا کہ دلی کے گلی کوچوں کی خاک چھان رہے تھے اور ان بوڑھوں اور بڈھیوں کا کھوج

لگاتے پھرتے تھے جنھوں نے غالب کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان کی اس تحقیق کی دنیائے ادب نے بہت داد دی وہ دو مقالے غالبیات میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ مگر علامہ اقبال کے جشن صد سالہ کے سلسلہ میں انھوں نے جو سرگرمی دکھائی اس کی داد کم ملتی، بیداد زیادہ ملتی۔

پاکستان میں آپ علم و ادب کے بارے میں تھوڑے سے سنجیدہ ہو جائیے، بیداد خود بخود آپ کو ملتی چلی جائے گی۔ وائس چانسلری کے زمانے میں خاں صاحب نے منصوبہ بنایا کہ یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام غالب کا جشنِ صد سالہ منایا جائے۔ اس پر افسرانِ بالا نے الگ ناک بھوں چڑھائی اور اہلِ سیاست الگ ناراض ہوئے۔ جشن کا وقت آنے سے پہلے ہی یونیورسٹی سے وہ سبک دوش کر دیے گئے، مگر اصلی کام انجام پا چکا تھا، یعنی غالب کی ساری نظم و نثر کتابوں کے ایک سلسلہ میں چھپ چکی تھی۔ بس وہ ایک مختصر سا زمانہ تھا جب پاکستان کی تاریخ میں پنجاب یونیورسٹی کو ایک علمی وقار حاصل ہوا اور اس تاریخ سے اس کا رشتہ پیدا ہوا جس کا پاکستان حاصل ہے۔ ورنہ اس یونیورسٹی کو ہم نے پہلے بھی دیکھا تھا اور خاں صاحب کی رخصتی کے بعد سے بھی دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔

تعلیم، تہذیب، ادب، قومی معاملات، یہ معاملات تو ہوئے، مگر ڈاکٹر وزیر آغا نے روحانیت میں ان کے شغف کا پتہ دیا۔ مولانا صلاح الدین احمد اور حمید احمد خاں کا اکٹھے ڈاکٹر وزیر آغا کے والد کے پاس پہنچنا اور اس صاحب سلوک سے فیض حاصل کر کے واپس ہونا۔ اصل میں باتیں کرنے کے لیے بہت تھیں۔ کچھ باتیں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کیں۔ کچھ باتیں انجم رومانی نے کیں، کچھ باتیں شہرت بخاری نے کیں۔ یہ تو رسمی جلسے کی باتیں ہوئیں مگر غیر رسمی جلسے جو ہو رہے ہیں۔ جہاں چار پڑھے لکھے آدمی جمع ہوئے اور خاں صاحب کی باتیں ہونے لگیں۔ کوئی کوئی شخص اس طرح رخصت ہوتا ہے کہ یادوں کا ایک جہان پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

"بدلتا ہے رنگ آسماں"

افسانوی مجموعہ

(زیرِ طبع)

آغا سہیل

۱۹۴۸ء سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ لیکن اس مجموعہ میں
۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۲ء تک کے افسانوں کا انتخاب شامل ہے
آغا سہیل کے فن کے بارے میں سنجیدہ ادبی حلقوں نے ہمیشہ اچھی رائے دی ہے۔ آپ بھی رجوع فرمائیے۔

مکتبۂ اقبال بک کارنر، گلبرگ ۲، لاہور
سول ایجنٹ — مکتبہ کتاب نما فنون — ۴۷۔ انار کلی لاہور

پروفیسر اقبال مرزا

حمید احمد خاں کی شخصیت

حضور اکرمؐ سے عشق، اُجلی زندگی اور پاکستان سے گہری محبت سے عبارت ہے

"قاضی، کمالی، باقر رضوی، بھائی حامد خاں، میں زندہ ہوں نا؟ آپ مجھے زندہ دیکھ رہے ہیں نا؟ میرے بھائی کو کسی بدخواہ کا فون ملا ہے کہ حمید احمد خاں مر گیا"۔ مقام اسلامیہ کالج سول لائنز میں کالج ہال کے قریب۔ اور سال اگر بھول نہیں رہا ۱۹۶۰ء، اور اگر بھول رہا ہوں تو تعجب بھی نہیں۔ کیونکہ حمید احمد خاں کی آواز کے سامنے مہ و سال اور صبح و شام کی کیا حقیقت تھی۔ ہم میں سے بعض طالب علم اس کمرے میں تھے، جو ایم۔ اے لائبریری کے برابر ہوسٹل کے رُخ ایم۔ اے انگریزی کا کمرہ ہوا کرتا تھا۔ رؤف اور بعض دوسرے دوست میرے ساتھ لائبریری کے سامنے والے لان میں تھے کہ ہم نے جانی پہچانی پاٹ دار آواز سُنی۔ جس کے استحکام میں کبھی کوئی شگاف نہ پڑا۔ اور جس کے آہنی آہنگ میں بے سُرے اور شدید زیر و بم کبھی واقع نہ ہوئے۔ بعض احباب ہیں کہ بولتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی توپ کا دہانہ کھُل گیا۔ مگر عین گولہ باری کے دوران، کسی باریک سی شہنائی کی آواز بھی سنائی دے جاتی ہے۔ یا جیسے انجن نے اپنی بھاری بھرکم بھک بھک شروع کی اور گارڈ کے ڈبے سے لکیر کی طرح سیٹی کی آواز آئی۔ جب منہ سے باریک سی آواز آتی ہے تو آواز کا بھرم ٹوٹ جاتا ہے۔ انسان بے سُرا ہو کر خود اپنی نگاہ میں خفیف ہو جاتا ہے۔ جس طرح مولانا علم الدین سالک کی آواز کا بھرم مرتے دم تک قایم رہا۔ اسی طرح پروفیسر حمید احمد خاں کے ہاں صوتی وقار میں کبھی کوئی جھول واقع نہ ہوا۔ اسلامیہ کالج کے ان دونوں جلیل القدر اساتذہ کے میری طرح سیکڑوں شاگرد ہوں گے۔ جن کے ذہنوں کے ٹیپ پر ان کی آوازیں ریکارڈ ہیں۔ ان کے ریکارڈ روم نے ان آوازوں کا تیا پانچہ کر کے ان کی انفرادیت جانچی ہوگی۔ قدرت مشکل سے دو صورتیں ایک سی بناتی ہے۔ اسی طرح شاذ و نادر یہ ہوتا ہے کہ دو صدائیں ایک سی ہوں۔ اگر ایک سی ہوتیں تو لوگ نقالی نہ کرتے اور یہ میرا دعویٰ ہے کہ حمید احمد خاں کی صوتی نقالی قریب قریب ناممکن تھی۔ اس آواز کی گھمبیرتا کے لیے حمید احمد خاں کے الفاظ چننے کا سلیقہ بھی ہونا چاہیے۔

"حمید احمد خاں مر گیا"۔ کوئی معمولی آواز نہ تھی جس نے سُنا وہ پرنسپل اسٹاف روم کی طرف دوڑا۔ اور ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء کو جس نے سُنا وہ بیگم روڈ کی طرف نکل بھاگا۔ میرے پاس حمید احمد خاں کے پکا مسلمان ہونے کے تین ثبوت تھے۔ اُن کی اُجلی زندگی، علامہ اقبال سے ان کی عقیدت، اور پاکستان کے لیے جذبۂ قربانی، اس سال سیرت النبیؐ پر اُن کے

مضمون اور اس کے چند دن بعد جمعہ کے روزِ سعید اُن کی وفات اور یومِ پاکستان پر اُن کی تدفین نے تین اور ٹھوس ثبوت بہم پہنچا دیے۔

۲۳ر مارچ کی اس دوپہر ہوا بہت تیز تھی اور لاہور خاک بسر تھا۔ میں بھری دنیا میں تنہائی کے شدید احساس میں مبتلا تھا حمید احمد خاں میرے لیے ان چند لوگوں میں سے تھے۔ جن سے بہت بے تکلفی نہیں ہوسکتی تھی۔ جن سے ہر وقت ملنے کی ہمت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر جن کے ہونے سے سکون، استحکام، اعتماد اور یقین کی دولت دل کو ملتی تھی، اور یہ احساس بھی کہ زندگی اب بھی وہی ہے جو بیس برس پہلے تھی ہم اب بھی وہی ہیں جو بیس برس پہلے تھے۔ میں ان خیالات میں محو ۱۹۴۶ء کی ایک دوپہر کی طرح شاہراہِ قائدِ اعظم کی پٹڑی پر چلا جا رہا تھا کہ میرے تصور میں یونیورسٹی کی جانب سے ایک جلوس اُبھرا، بڑے باوقار لوگوں کا جلوس جیسے علم اپنے عمامے اور شملے تھامے، لاہور کی سڑکوں پر نکل آیا ہو۔ حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ہر دو کان پر رُک کر ہر بورڈ پر اُردو سوار کرا رہے تھے۔ میں نے اُنھیں وائس چانسلر کہا ہے۔ آپ درست کر لیجیے۔ اور شیخ الجامعہ سمجھیے۔ ورنہ میرے اس انگریزی پیوند پر استاد ناراض ہو جائیں گے۔ انھوں نے یونیورسٹی کی صورت بدل دی۔ وہ اسلامیہ کالج سول لائنز کا ناک نقشہ درست کر کے آئے تھے۔ ان کا شاہجہانی عمل یہاں بھی شروع ہو گیا۔ شعبوں کے نام اردو ہو گئے۔ ادارۂ فلکیات سے لے کر شعبۂ تاریخ ادب انگریزی اور علوم عمرانیات اور تحقیق و تدریس کے تمام شعبے اردو میں نہا گئے۔ ان کے زمانے میں صدائے کُن فیکون دمادم آتی رہی اور گیسوئے اُردو اُن کے شانے سے سنورتے رہے۔ ان کے بس میں نہیں تھا۔ ورنہ یونیورسٹی جسے انھوں نے جامعہ بنا دیا، سرتاسر بدل کر رہ جاتی۔ انھیں اختیار حاصل ہوتا تو وہ لڑکوں کو پھاوڑے دے کر اپنے ہاتھ میں کدال تھام کر پُرانے بُت کدے مسمار کر دیتے۔ شاید انھیں اپنی مجبوریوں کا شدید احساس ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وائس چانسلر حمید احمد خاں، پرنسپل حمید احمد خاں سے عمر میں بیس سال بڑے لگنے لگے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں کسی طرح ۳۵ سال سے زیادہ کے نظر نہیں آتے تھے۔ لٹن سٹریچی نے فلارنس نائٹ انگیل کے سوانحی مضمون میں لکھا ہے کہ "وہ اپنی دھن کی اتنی پکّی تھی اور کام میں اتنی مگن، کہ خدا کی حیثیت بھی اس کے نزدیک (نعوذ باللہ) ایک انجنیئر کی سی تھی اور اس کا بس چلتا تو اسے بھی وہ اپنے ساتھ کام میں جوت دیتی۔" حمید احمد خاں مسلمان تھے اور محنت ان کا ایمان تھا۔ کام کا جہاں تک تعلق ہے وہ مولوی عبدالحق کے نام دیو۔ مالی سے کم نہ تھے۔ جو پھولوں کی کیاریاں اپنے خون سے سینچتا تھا اور جب پھول کھلتے تو خود کھل اٹھتا۔ ایسے ہزار ہا پھول اس "نام دیو" نے دو لنوں اسلامیہ کالجوں، یونیورسٹی، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور مجلسِ ترقی ادب میں کھلائے۔ مگر جہاں پھول ہوتے ہیں۔ کانٹے بھی اُگتے ہیں۔ حمید احمد خاں گلستاں میں زہریلی بوٹیاں اور نوکیلے کانٹے دیکھتے تو کدال لے کر خود اکھاڑنے لگتے۔ ان کے ہاں قینچی سے تراشنے کا عمل بھی تھا۔ لیکن زمانہ زہریلی جڑی بوٹیوں کا تھا اور گلستان تیزی سے جنگل بنتے جا رہے تھے۔ بیچارے حمید احمد خاں اکیلے رہ گئے وہ کیاریوں، چمنوں اور گلدستوں کے مالی تھے، جنگل کے نہیں تھے۔ مگر وہ اپنی دُھن میں ہوا کے سامنے چراغ لے کے چلے۔

سالِ اول ۱۹۴۵ء میں ہی ان کے چلن، رکھ رکھاؤ اور ان کی ممتاز شخصیت کا سکّہ دل پر بیٹھ گیا تھا۔ پھر ۱۹۴۶ء میں جب اپنے جگرِ لخت لخت کو جمع کر کے تعلیم کے تیسرے سال میں قدم رکھا اور ایک مہاجر کیمپ نما مکان سے بے سر و سامانی کے ساتھ کلاس میں جا بیٹھا تو جانی پہچانی آواز ڈائس سے گونجی۔ غالب نے ۱۸۵۷ء کی تباہی کو قیامت

اور اس کے اختتام کو اپنے دوسرے جنم سے تعبیر کیا ہے۔ اس نئی زندگی میں انھیں پچھلے جنم کی آوازیں سنائی دینے لگیں تو زندگی پر ان کا اعتماد بحال ہونے لگا تھا۔ کچھ یہی کیفیت میرے دل میں حمید احمد خاں کی آواز نے برپا کر دی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ اسی اپنے انداز میں نپی تلی انگریزی میں کہ ملکہ الزبتھ نے فیری کوئین کا کیا صلہ دیا؟ آئرلینڈ کی گورنری؟ یہ عطا کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو مشرقی پنجاب سے لٹ لٹا کر آئے ہیں انھیں اگر حکومتِ پاکستان اضلاع انبالہ کی یا امرتسر کی ملکیت کے تمسکات دے دے تو ان کے دل پر کیا بیتے گی؟ سو ایسا مذاق بے چارے شاعر سپنسر سے ہوا۔ ادبی نکتے، فلسفیانہ رموز اور ثقافتی مسائل کو ذہن نشین کرانے میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ الفاظ کے پرے کے پرے ان کے حضور دست بستہ کھڑے رہتے تھے اور وہ بڑی صفائی سے جس کو رکمانڈر کو آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے وہی محاذ ذہن تک آتا۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ یہ کو رکمانڈر وار کیے بغیر خالی پلٹ گیا ہو۔ وہ دست بدست جنگ کے قائل تھے۔ الفاظ کے ہر سپاہی کے قدر شناس تھے۔ اسی لیے اناڑی میر لشکر نہ تھے کہ ان کی کھیپ کٹوا دیتے۔ ہر لفظ ایک بہادر جاں باز کی طرح اُجلی وردی میں سامنے آتا اور للکارتا۔ وہ مبارزہ طلبی کے قائل تھے۔ بھیڑ بھاڑ کے قائل نہ تھے۔ الفاظ کے ان کے لشکر میں گورے اور کالے دونوں قسم کے سپاہی تھے۔ مگر گوروں کالوں کو انھوں نے کبھی خلط ملط نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ انگریزی میں وہ اسی رکھ رکھاؤ سوچ بچار اور اہتمام سے کام لیتے جیسے اردو بولتے وقت انھوں نے کبھی غالب کو محض غالب نے ذوق کو صرف ذوق، اور حالی کو حالی نہیں کہا، بلکہ اسد اللہ خاں، محمد ابراہیم اور الطاف حسین کے نام یوں ادا کرتے جیسے غالب، ذوق اور حالی کھچے چلے آرہے ہیں۔ "اہتمام" ایسا لفظ ہے جس میں ان کی شخصیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جن لوگوں نے انھیں انگریزی لفظ "آل دو" ALTHOUGH بولتے سنا ہے۔ وہ ان کے تلفظ ادائیگی "زور اور ٹھہراؤ" کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو جیٹ ملکہ راکٹ کی رفتار سے بولتے چلے جاتے ہیں۔ گویا لمحوں میں الفاظ کے دریا بہا دیتے ہیں۔ شبنم کی طرح انھیں بہنا نہیں آتا مگر ان کے مجموعی تاثر پر حمید احمد خاں کی زبان سے ادا ہونے والے دو لفظ حاوی ہو جاتے تھے۔

حمید احمد خاں کو ملٹن کی طرح اپنی تصنیفی صلاحیت پر بہت مشکل سے اعتبار آیا ہو گا۔ ملٹن کے مرثیہ لی سی ڈس LYCIDAS پر مزے لے لے کر تبصرہ فرمایا کرتے تھے کہ کیمبرج (کرائسٹ کالج) کے زمانۂ طالب علمی میں اس کے کالج کا ایک ہونہار طالب علم ایڈورڈ کنگ بحری سفر میں ڈوب مرا۔ ملٹن کی مشقِ سخن کا زمانہ تھا۔ دوستوں نے کنگ کا مرثیہ لکھنے پر مجبور کیا۔ بادلِ ناخواستہ قلم اٹھایا اور یوں ابتدا کی کہ ابھی شجرِ سخن میں میوۂ ناپختہ اور نارس ہے، اور مجھے اس کچے پھل کو توڑنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ ذرا تحقیق کی جائے تو یہ جاننا مشکل نہیں ہو گا کہ استاد نے کسی مجبوری کے تحت لکھنا شروع کیا۔ اور ابتدائی کاوش کے کیا ثمرات تھے؟ بہر حال ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ وہ ہر لیکچر اس اہتمام سے دیتے تھے، جیسے ان کی زندگی کا یہی واحد لیکچر ہے۔ مجھے کوئی تعجب نہ ہو گا۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ حمید احمد خاں لیکچر کا باقاعدہ پلان بناتے تھے۔ کیونکہ ایک بار بوطیقا پڑھاتے ہوئے انھوں نے بے اختیاری میں اس کا پلان تختۂ سیاہ پر لکھ ڈالا۔ پلان کے تحت قدم اٹھانا اور اس خوبصورتی سے کہ فطری اور بلا تکلف معلوم ہو۔ استاد کا معمول زندگی بن گیا تھا۔ ان کے مسودات پر، اگر محفوظ ہوں، نظر ڈالی جائے تو مجھے یقین ہے کہ رد و بدل کی پنسل نے کئی کئی رنگ بدلے

ہوں گے۔ ان کی احتیاط اور ان کا اہتمام ان کی گفتار و تحریر کے علاوہ ان کے لباس، ان کی رفتار میں بھی صاف جھلکتا تھا۔ اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں انھیں پرانی مگر ستھری سائیکل سے اترتے دیکھا ہے۔ جھنگ کے بنے ہوئے بھورے ٹویڈ کے موٹے چیک کوٹ میں ملبوس تھے (ملبکہ ہوا کرتے تھے) اس پر گہری براؤن ٹائی بگلے سے سفید کالر میں بہت پھبتی تھی۔ پھر اسی رنگ کی وورسٹڈ پینٹ۔ اس سستے کمپی ٹیشن میں بھی حمید احمد خاں کا ذوق جمال اپنی رعنائی میں یکتا تھا۔ اتاترک کی طرح پشت سر کی طرف سجے ہوئے بال جن سے پیشانی بہت کشادہ نظر آتی۔ باریک بھوؤں کے نیچے روشن آنکھیں، ستواں ناک، ہونٹ پتلے، اور قلن شیو چہرہ جو نہ بالکل کتابی نہ گول، قد میانہ کہا جا سکتا، اگر جسم پر ڈاکٹر تاثیر کی فربہی ہوتی تو قد چھوٹا کہلاتا۔ اسلامیہ کالج سول لائنز کے پرنسپل آکسفورڈ منی مورس کی سبز کار سے قیمتی سوٹ میں اترتے تو بھی وہی سن پینتالیس کے حمید احمد خاں معلوم ہوتے، کیونکہ اُس اور اِس حمید احمد خاں میں نفاست پسندی، شرافت اور علمی وجاہت مشترک تھی۔ شیطان کی تعبیر مختلف طبائع مختلف انداز سے کرتی ہیں بعض لوگ اسے حسد، بغض اور غصے کا دیوتا کہتے ہیں اور بعض اسے تلبیس و فریب کی صورت سے جانتے ہیں۔ حمید احمد خاں کے نزدیک اس کا سب سے کریہہ منظر سطحیت، بازاری اور سستے پن میں تھا۔ یہ سطحیت خواہ رپورٹروں میں ہوتی یا رہنماؤں میں، علماء میں ہوتی یا اساتذہ میں، ان کی نفرت کی مستحق ٹھہرتی تھی۔ انسانی جمال بندی کے اس نقشے میں بد ذوقی سطحیت اور سستے پن کی مخفی لکیریں غائب تھیں۔ شخصیت کوئی بھی ہوتی، استاد اس کی مکمل تصویر کے عکس کے لیے کوئی نہ کوئی مرکزی لفظ ضرور ذہن میں رکھتے تھے۔ مثلاً حالی کے لیے شرافت، غالب کے لیے وجاہت، ملٹن کے لیے CHASTITY یعنی پاکیزگی۔ اپنے لیے بھی ان کے ذہن میں 'محتاط' جیسا کوئی لفظ ضرور ہو گا۔ غالباً اسی لفظ کے توسط سے ہم ان کی شخصیت کا تصور قایم کر سکتے ہیں۔

معصوم ذہن سیاسی رہنماؤں اور بزرگوں خصوصاً اساتذہ کے امیج قایم کر لیتے ہیں۔ پھر امیج کی شکست و ریخت شروع ہو جاتی ہے۔ حمید احمد خاں کی شخصیت کا جو پرتو میرے ذہن میں اس وقت قایم ہوا تھا۔ جب میں سال اول کا طالب علم تھا۔ اس سے کہیں زیادہ شان و شکوہ کے ساتھ اب بھی اپنی انہی ابتدائی بنیادوں پر قایم ہے۔ میری زندگی کا بہرحال یہ اچنبھا ہے کہ حمید احمد خاں کو میں نے انگریزی میں ملٹن کے روپ میں دیکھا اور میں اب تک یعنی ۲۵ سال بعد اسی نظریے پر مصر ہوں۔ اردو میں میں نے انھیں غالب کے روپ میں دیکھا اور اس امیج میں بھی کسی تبدیلی کا روادار نہیں، ملٹن پر ان کی تصنیف اور نسخۂ حمیدیہ میرے اس قایم کردہ امیج سے بہت بعد کی چیزیں ہیں۔ میرے اسی امیج کی تشکیل میں ان تصانیف کو کوئی دخل نہیں۔ مجھے تو ان کے اہتمام، رکھ رکھاؤ، نفاست پسندی اور عقیدے کی پختگی سے خیال ہوا تھا کہ انگریزی ادب میں اگر کسی کے قریب ہیں تو ملٹن کے ہیں۔ ارسطو اور ملٹن جس اہتمام سے انھوں نے ہمیں پڑھائے۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ ان کی تحریر کی طرح ان کی شخصیت سے بھی متاثر ہیں۔ شیکسپیئر یقیناً انگریزی ادب میں بہت بلند مقام پر فائز ہے لیکن ملٹن کی طرح اسے احساسِ ذات نہیں ہے۔ ملٹن جس طرح نظام کائنات میں یزدانی اور اہرمنی قوتوں سے برسرِ پیکار نظر آتا ہے۔ کچھ وہی کیفیت حمید احمد خاں کی ذات میں نظر آتی تھی۔ خیر و شر کی آویزش ہوتی یا کسی نظریے کے تحفظ کا سوال۔ وہ نکلتے تو اندھی قوتوں سے لڑنے کی سکت لے کر سر بکف نکلتے تھے۔ یہی ارتفاعِ مقام اور اہتمامِ تشخص غالب کے ہاں بھی ہے۔ جس کی انا کے سامنے دنیا بازیچۂ اطفال ہے۔

اورنگ سلیمان اک کھیل اور اعجاز مسیحا محض اک بات ہے۔

وہ زود حس ضرور تھے مگر زود رنج نہیں تھے۔ وہ نہ جلدی گھل مل جانے والے تھے اور نہ مل کر بھول جانے والے تھے۔ ان کے احساسات نازک تھے اور اپنے قایم کیے ہوئے معیارِ حیات کو گرد و پیش میں جاری دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اکثر چوٹ کھاتے تھے۔ وہ جذباتی ہو جاتے مگر جذبات میں کیے ہوئے فیصلوں کو خود ہی مسترد کر دیتے۔ ۱۹۶۰ء کی سردیاں کا زمانہ تھا۔ پرنسپل حمید احمد خاں کا حکم جاری ہو چکا تھا کہ طلبہ یونیفارم میں آیا کریں۔ سبز کوٹ یا بھورے رنگ کی جرسی میں۔ فن کار کی حس نقل اور حس تخلیق پر آفتابی کرنیں پڑ رہی تھیں کہ اچانک ان کی نظروں کی ٹارچ کا رخ ہوسٹل کی جانب ہو گیا۔ وہاں سے نعرہ زن ایک طالب علم شلوار اور قمیص میں نکلا ——— حمید احمد خاں افلاطونی نظریۂ شاعری کو میز پر بیچ کھڑکی سے کود گئے۔ اور اس لڑکے کی طرف لپکے، وہ الٹے قدموں بھاگا۔ ادھر سے کوئی صاحب آرہے تھے۔ انھوں نے لڑکے کو پکڑ لیا۔ حمید احمد خاں کے چانٹے کی آواز ہم نے سنی، کلاس ختم ہو گئی۔ لڑکا پرنسپل کے سامنے حاضر، پوچھا گیا یونیفارم کیوں نہیں پہنی؟ یتیمی کا کوئی معاملہ بیچ میں آیا تھا۔ یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ مگر حمید احمد خاں کو روتے سب نے دیکھا، فوراً قاضی صاحب (ہیڈ کلرک) کی طلبی ہوئی۔ حکم ہوا کہ سوٹ کے پیسے فوراً کسی نہ کسی مد سے ادا کیے جائیں۔ حمید احمد خاں اس رنگ کے شگفتہ پھول تھے۔ جن کی تر و تازگی کے لیے آبیاری لازمی تھی مگر ارد گرد کی زمین شور ہوتی جا رہی تھی۔

ان کا سفرِ ملازمت اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے شروع ہو کر شاہراہ قائد اعظم کے سول لائنز اور یونیورسٹی والے سرے سے ایچی سن کالج والے سرے پر مجلس ترقی ادب کی نرسنگھ داس بلڈنگ میں ختم ہوا۔ وہ استاد سے وائس چانسلر پھر ڈائرکٹر، کل ملک میں معزز اور پھر مختلف وفود کے محترم سربراہ ہوئے۔ لیکن حمید احمد خاں لیکچرار کے پاس بیگم روڈ پر جو مکان تھا وہ وہیں رہا۔ پچیس تیس سال کے عرصے میں کوڑیا، کوڑی والے لکھ پتی اور کوڑی کے ڈھیر سونا اگلنے کی مشینیں بن گئیں۔ مگر حمید احمد خاں محنت کا میا دہی نام دیو مالی ہی رہا۔ لوگوں کو عموماً دو طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کام کرنے والے اور دوسرے بیکار اور نکھٹو، نکمے کام کرنے والی برادری میں بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک کام چور اور دوسرے "نام دیو" مالی۔ کام چوروں کے نام نہاد حقوق دلانے کے لیے انجمنوں کی کمی نہیں۔ مگر دنیا میں ایسے نام دیو بھی ہیں جو نام کے ہی نہیں کام کے بھی دلو ہیں۔ چپ چاپ کام کیے جاتے ہیں۔ انھیں اپنی کیاریوں سے اس لیے عشق ہے کہ پھول کھلیں گے۔ چمن میں بہار آئے گی۔ یہی ان کا صلہ ہو گا۔ وہ اپنی لگن، اپنے فن میں معاوضے کے اتار چڑھاؤ سے کمی بیشی نہیں کر سکتے۔ ان کی محنت کے لیے نہ پنشن کی گارنٹی ہے۔ نہ گریجویٹی کی۔ ان کی محنت کا صلہ یہی ہے کہ ان کے بارِ محنت میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ حمید احمد خاں اپنے بوڑھے ہوتے جسم پر بار کا اضافہ کرتے ہی چلے گئے۔ میں نے انھیں وائس چانسلر کے کمرے میں فائلوں کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھے دیکھا اور ان کے دو قیمتی منٹ ضایع کر کے عمر بھر کی ندامت اپنے سر لے آیا۔ ہوا یہ کہ میں نے لاہور کے ایک کالج میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے انھیں ایک خط لکھ ڈالا جس میں خواہش ظاہر کی کہ انگریزی ادب میں ریسرچ کے لیے کام چاہتا ہوں۔ وہ چاہتے تو ان کا سیکرٹری وقتِ ملاقات کی اطلاع دو لفظوں میں مجھے دے دیتا۔ مگر انھوں نے میرے دو صفحے کے خط کا چار صفحے میں جواب دیا اور ملاقات کا وقت دیا۔ جب انھوں نے فرمایا کہ پنجاب یونیورسٹی میں انگریزی پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے سر دست کوئی انتظام نہیں تو آپ میری خفت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ احساس جرم کیا کم تھا کہ اتنی سیدھی بات جو انکوائری سے معلوم ہو سکتی تھی ان کے دو منٹ ضایع

گر گئی۔ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے معاملات یونیورسٹی کے عزیز طلبہ ان کے در پر ڈھیر کر آتے تھے۔ جس شخص نے اپنی عمر کے آخری پچیس سال میں تیزی سے وہ فاصلے قطع کیے تھے جو عموماً پچاس سال میں طے ہوتے جس نے وقت کے ایک ایک لمحے پر سخت گرفت رکھی اس کے بیسیوں گھنٹوں کو لوگوں نے بے دردی سے کچلا۔ پینتالیس برس تک کام کرنے کی ان کی جو رفتار رہی ہو گی آخری ۲۵ سال میں کم از کم دس گنا تو ضرور بڑھ گئی ہو گی۔ پچاس برس کی عمر میں ایم۔لٹ کیمبرج سے پھر ایک بے قابو بے ہنگم بڑے سے ادارے کی پرنسپلی، پھر اس سے بھی زیادہ بے ترتیب دیمک خوردہ اور متزلزل ادارے کی سربراہی پھر انتظامی امور کے بعد تصنیف و تالیف مجلس ترقی ادب تمام ہمدرد میں تقاریر، بیرونی ممالک میں نمایندگی۔ ان سب ذمہ داریوں میں عمر کی ترقی کی نسبت سے دس گنا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ قضا و قدر کے فرشتے عمر کے اس حصے میں حکم دیتے ہیں۔ آہستہ خرام بلکہ مخرام جس میں آرام و سکون کا جوگ اور سنیاس ضروری ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں بغیر یونین کا یہ مزدور محنت کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ سمندر میں اس غروب آفتاب کا نظارہ میں نے مکمل غروب سے دس دن پہلے کیا تھا۔ ہوا یوں کہ اچانک بیٹھے بیٹھے دل میں خیال آیا کہ ڈراموں کا مجموعہ چھپے تو اس کے ساتھ استاد کا تعارف شامل ہو جائے۔ میری تصنیفی زندگی کے لیے یہ خیال بہت بڑا سرمایۂ حیات تھا پورچ سے برآمدے میں اور برآمدے سے اس چوکور وسیع کمرے میں داخل ہوا جو نرسنگھ داس کوٹھی کے دوسرے کمروں میں گھرا ہوا ہے۔ آیئے تشریف رکھیے۔ کہیے کیسے آنا ہوا (قہقہہ ہنسی سے فلاں دوست نے ڈراموں کا ایک نسخہ ترتیب دے کر پیش لفظ کے لیے بھیجا تھا چھ ماہ سے اوپر ہو چکے ہیں میز کی دراز میں پڑا ہے۔ علامہ اقبال پر مضمون لکھ رہا ہوں اس یوم اقبال پر پڑھوں گا۔ لیکن کام کی زیادتی اتنی ہے کہ بمشکل ایک آدھ صفحہ لکھ پاتا ہوں جسٹس ایس۔ اے رحمان میرے بچپن کے دوست ہیں۔ یعنی قلم دوات اور تختی کے زمانے سے، ان کے لیے پیش لفظ لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر کئی مہینے ہو چلے ہیں کچھ نہیں لکھ سکا جب بھی تقاضے کا فون آتا ہے شرمندہ ہوتا ہوں (فون) ہیلو آداب عرض ہے بھائی، آپ کی بڑی طویل عمر ہے اتفاق دیکھو جسٹس رحمان کا فون ہے) ابھی ابھی ایک عزیز شاگرد سے آپ کا تذکرہ کر رہا تھا۔ جی ہاں وہی آپ کے کلام کے سلسلے میں پیش لفظ کی بات ہو رہی تھی۔ اطمینان رہیے میں جلد ہی وقت نکالوں گا۔ اچھا خدا حافظ۔ ہاں تو اقبال صاحب مجموعہ پریس میں کب تک بھیجنے کا ارادہ ہے۔ دیکھو بھئی اب میری صحت قابلِ اطمینان نہیں رہی۔ میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ کم از کم اس سال تو نہیں۔ اچھا اکتوبر نومبر میں مسودہ تیار ہو گا۔ پھر ٹھیک ہے زندہ رہا تو دسمبر یا جنوری ۱۹۷۵ء میں ملنا، میں پیش لفظ لکھوں گا۔ اے بھئی کون کہتا ہے کتنے دن اور جینا ہے۔

یہ آخری جملہ میرے اس جملے کے بعد ادا ہوا تھا کہ میں غالب تو نہیں، آپ کے لیے ہزار برس جینے کی دعا مانگوں، ہاں دلی جذبات یہ کہتے ہیں کہ جب تک ہم زندہ ہیں آپ اسی طرح کام کرتے نظر آتے رہیں۔

انھی خیالات میں مگن گھومتے گھماتے شاہی مسجد جا پہنچا تھا اس کے پھیلے ہوئے دائیں بائیں دونوں بازوؤں میں طلبہ کے کمرے خالی تھے (تقریباً دو سو برس سے) اور کرائسٹ چرچ ٹرینٹی کالج (کیمبرج) کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے حجروں میں سیکولر طلبہ کی دنیا سمٹی ہوئی تھی۔ تقریباً ہزار برس سے مذہب کے خلاف شور مچانے والے مذہب کے دامن کو نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ حمید احمد خاں کے مشاہدات اور استنباط تھے، لوٹتے ہوئے مزار اقبال پر استاد کی مغفرت کی دعا کی۔ قلعے کی جنوبی دیوار سے ہوتا ہوا مستی گیٹ، مسجد بیگم شاہی پھر سید مٹھا، لوہاری انارکلی غرض ان کے خیال کے ساتھ جگہ جگہ آوارہ پھرا۔ لاہور میں کوئی تبدیلی نہیں تھی وہ مغلوں کی عظمتوں، انگریزوں کی عنایتوں کو زیرِ دامن لیے پہاڑ کی اٹل استقامت کی طرح کھڑا تھا۔ اس کے دامن کی خاک کتنی تابناک ہو گئی ہے۔ کہاں کہاں سے کیسے کیسے لوگ یہاں کھنچے چلے آئے شہنشاہ جہانگیر، مغل شہزادے شہزادیاں، غیاث بیگ کی بیٹی برِصغیر کی ملکہ سیالکوٹ کا درِ نایاب اور اب کرم آباد کا گوہرِ آبدار میں اس مٹی کو "لئیم" نہیں کہہ سکتا، نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مٹی کو پاؤں پکڑنا نہیں آتا، یہ تو بھرے خزانے اپنی طرف مائل کرتی ہے اور آغوش میں سلا دیتی ہے۔

ابنِ انشا

یادِ یارِ مہرباں

لدھیانے سے ہم نے میٹرک پاس کیا تو آگے کی فکر ہوئی۔ نمبر ہمارے اچھے تھے بلکہ یونیورسٹی میں پوزیشن بھی تھی، کہیں بھی داخل ہو سکتے تھے۔ خود لدھیانے میں اچھا خاصا گورنمنٹ کالج موجود تھا۔ اور ہمارے اپنے ضلع کے صدر مقام جالندھر میں کئی کالج تھے۔ لیکن مرحوم حمید نظامی نے جن سے ہماری دوستانہ خط و کتابت تھی تجویز کیا کہ لاہور آؤ — اسلامیہ کالج میں پڑھو۔ لاہور کا اسلامیہ کالج پنجاب کا علی گڑھ تھا اور (پندرہ روزہ یا پھر ہفت روزہ) نوائے وقت کے روزِ اول سے قاری ہونے کے باعث قوم اور اسلام بلکہ اسلام سے زیادہ مسلم لیگ کا درد دل میں بہت تھا۔ پس ہم نے کہا۔ اٹھاؤ ڈھول اور تاشے اور چلو لاہور۔

اور یوں اسلامیہ کالج میں داخلے کی تقریب سے ہماری دفتر حمید احمد خاں کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ یہ پہلی حاضری تھی۔ آخری حاضری پچھلے سال لاہور میں ہوئی جب نہ جانے کس میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد ہم اپنی اُدھار مانگی ہوئی گاڑی میں ان کو ان کے سرسبز پُرفضا مکان میں چھوڑنے گئے۔ کالج میں داخلے سے پروفیسر صاحب کا کوئی راست تعلق نہ تھا۔ لیکن ہمارے ہاں تعارفی رقعہ حمید نظامی مرحوم کا تھا، اور وہ نظامی صاحب کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے۔ اخلاق سے تو وہ سب سے ملتے تھے، ہم پر بھی شفقت ہوئی۔ فارم دفتر سے منگایا، اپنے سامنے بھروایا۔ اس میں ہم نے اپنا اصلی نام شیر محمد خاں لکھا تو محمد کے ہجے MOHD. لکھ گئے۔ اسکول میں بھی بیشتر ایسے ہی لکھتے تھے۔ پروفیسر صاحب نے ہمیں ٹوکا اور کہا یہ ہمارے رسولِ اکرمؐ کا نام ہے۔ اسے کبھی مختصر نہ لکھنا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ ہم نے ہمیشہ اس مبارک نام کو پورا ہی لکھا۔

پروفیسر صاحب سے ہم نے نہیں پڑھا۔ وہ بی۔اے کو پڑھاتے تھے۔ ہمیں پروفیسر سید فیاض محمود پڑھاتے تھے اور کیا خوب پڑھاتے تھے۔ البتہ ہم ٹیوٹوریل گروپ میں پروفیسر حمید احمد خاں کے تھے۔ نام تو ہمارا پروفیسر ایس۔ ایم۔ اختر کے گروپ میں تھا، لیکن ہم نے بدلوا کر حمید احمد خاں صاحب کے گروپ میں کرایا۔ افسوس کہ ؏

روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

اس کالج میں ہمارا دانہ پانی زیادہ دن نہ رہا۔ سال بھر بعد ہم نے وہاں سے چھٹی کی اور پروفیسر صاحب

سے دوبارہ ربط ضبط قیام پاکستان کے بعد شروع ہوا۔ بلکہ اِن پچھلے چھ سات سال میں مرکزی اردو بورڈ کی نسبت سے۔ ہم اس کے ممبر تھے۔ وہ پہلے ممبر پھر چیئرمین ہوئے۔ پُرانی روایات اور وضعداری کے تحت ہم نے ان کو استادِ دہلی جانا اور کہا، اور انھوں نے ازراہِ ملاطفت قبول کیا۔ یونیورسٹی کی وائس چانسلری اور مجلس ترقیٔ ادب کی ڈائرکٹری کے زمانے میں بھی ان سے نیاز حاصل ہوتے رہے۔ اور کتابوں کی نمایشوں اور دوسرے انتظامات کے سلسلے میں بھی جب کبھی ہمیں ان سے سرکاری یا غیر سرکاری کام پڑا، وہ اپنی استاذانہ توجہ سے ہمیں نوازتے رہے۔

اگر ہم شاگرد تھے تو ان کے چوالیس ہزار پانچ سو اٹھانوے شاگردوں میں سے ایک تھے۔ ہمارے لیے یہ وجہِ مباہات سہی، ان کے لیے کچھ بات نہ تھی، اتنے شاگردوں کے نام بھی کوئی یاد نہیں رکھ سکتا۔ ان کے نام اور مقام، ان کے علم و فضل سے ہم ان سے متعارف ہونے سے پہلے سے واقف تھے اور متعارف ہونے کے بعد بھی یہی رشتہ جاننا چاہیے، جو مضمون ہمارے دل پر نقش ہے وہ جہازی سائز کے 'ادبی دنیا' میں شہزادہ خضر سلطان سے ان کی دلی میں ملاقات والا مضمون ہے۔ ہمایوں کے پرانے فائلوں میں ان کے مضامین بہت دیکھے، بلکہ ہمایوں کے دورِ اوّل میں جو ۱۹۲۵ء کے آس پاس تھا، ان کے فاضلانہ مضامین دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کیونکہ اس زمانے میں یہ بیس، بائیس برس کے رہے ہوں گے۔ حالیہ زمانے میں ان کے غالب پر کام نے اشتہار پایا۔ شروع کے رشتے آخر تک چلتے ہیں۔ اس لیے پروفیسر صاحب سے ہم اس طرح تو کبھی بے تکلف نہ ہو سکے، جس طرح ان کے برادرِ بزرگ حامد علی خاں مدیر 'ہمایوں' و 'الحمرا' سے رہے اور رہیں۔ تاہم یہی فخر ہمارے لیے بہت ہے کہ جو فیضان ان کی شخصیت اور علم سے ہم حاصل کر سکتے تھے، اس سے محروم نہیں رہے۔

شیشے کی آبرو

جواں سال افسانہ نگار

قمر عباس ندیم

کے منتخب اور بہترین افسانوں کا

نمایندہ مجموعہ

عنقریب شایع ہو رہا ہے

مرزا ظفر الحسن

ہم ذوق، ہمدرد، ہم داستان

پروفیسر حمید احمد خاں سے میرا جو رشتہ بلکہ کئی ناتے تھے مرحوم ہی کے الفاظ میں سنیئے۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو جو میرے نام موصوف کا آخری خط تھا تحریر فرمایا:

"برادرِ عزیز القدر

.... میری کوتاہیِ فکر ملاحظہ کیجیے کہ اب تک میں نے آپ کو صرف غالب شناس طبقے کے لیے ایک مرکزِ سعی و عمل قرار دے رکھا تھا۔ لیکن آپ کی پُر لطف کتاب ذکرِ یار چلے ہاتھ آئی تو اندازہ ہوا کہ غالب کی عظیم الشان برادری سے قطع نظر، حیدر آباد اور عثمانیہ یونیورسٹی کے رشتے سے ہم دونوں ایک ہی ہم ذوق، ہم درد اور ہم داستان کنبے میں شامل ہیں۔ یہ تصوریوں بھی دل کو گرما دینے والا تھا مگر آپ کی کتاب سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ میرے لیے اس کتاب نے گویا گردشِ ایام کا رُخ پلٹ دیا اور یوں معلوم ہوا کہ میں عابد شاپ[1] اور انگریزی[2] ٹپے خانے سے گزرتا ہوا پھر توپ[3] کے سانچے کی طرف رواں دواں ہوں۔ اور آغا منزل لیاقت منزل وغیرہ سلسلۂ عمارات میں ایک بار پھر ولنکر صاحب اور حسین علی خاں صاحب (اور خدا جانے اور کس کس استاد) کے لیکچروں میں شامل ہونے کے لیے سراپا اشتیاق ہوں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کو تیس برس کی زندگی نصیب ہوئی۔ لیکن کیسے تیس برس کہ مسلمانانِ برِ عظیم کی تاریخ میں ایک نیا باب کھُل گیا۔ آپ کے قلم کو خدا نے یہ طاقت دی کہ جو کل کی بات تھی وہ آج کی بات اور ہمیشہ کی بات بن گئی۔ مرحبا

---

[1] حیدر آباد دکن کا بارونق بازار۔

[2] حیدر آباد میں ڈاک خانے کو ٹپہ خانہ کہتے تھے۔ آزادی سے پہلے عابد شاپ پر امپیریل پوسٹ آفس تھا جسے انگریزی ٹپہ خانہ کہتے تھے۔ ریاست حیدر آباد کے باہر جانے والی ڈاک کا تعلق اسی ڈاک خانے سے تھا [3] ایک محلے کا نام

جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پانا میں اپنے لیے باعثِ شرف سمجھتا ہوں ۔ مجھے یہ اعزاز دراعزاز بھی نصیب ہوا جس لیاقت منزل اور آغا منزل میں حمید احمد خاں نے علم حاصل کیا اور جن پروفیسر حسین علی خاں سے موصوف انگریزی کے درس لیے وہیں اور اُن ہی سے میں نے بھی تھوڑا بہت سیکھا ہے ۔ آج سے چند سال پہلے انجمن طلبہ قدیم جامعہ عثمانیہ کراچی نے جامعہ کا جشن طلائی منایا تو اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود حمید احمد خاں صدار کرنے کے لیے بطور خاص لاہور سے آئے ۔ بڑے ولولے اور جوش کے ساتھ دکن کے اپنے آخری سفر کے حالات طالب علمی کے واقعات اور پرانے شفیق اساتذہ کی خدمت میں حاضری دینے کے قصے سنائے ۔ حسین علی خان صاحب کا اس وقت تک انتقال ہو چکا تھا، مگر آپ ان کے گھر گئے اہلِ خانہ کو پرسہ دیا ۔ اُن کا کتب خانہ بڑے شو سے دیکھا اور وہاں اپنے اُستاد کی یادیں مجتمع کرتے ہوئے کچھ وقت گذارا ۔ دوسرے اُستادوں اور پرانے ہندو مسلم دوستوں سے بھی ملے ۔ اردو سے والہانہ محبت ان کا ایمان اور جامعہ عثمانیہ کو اردو کا عظیم ادارہ تسلیم کرنا اس ایما لازمی جزو تھا ۔ جس محفل میں جامعہ کی بات چلی حمید احمد خاں کی زبان سے کلماتِ توصیف ہی نکلے ۔ وہ اپنی مادرِ علم کے سچے سپوت تھے ۔

غالب لائبریری کے شعبے "ادیبوں کے خطوط" میں فی الوقت مرحوم کے صرف دس خطوط محفوظ ہیں ۔ اصحاب کے نام حمید احمد خاں صاحب خطوط لکھتے رہے ہیں ۔ ان سے درخواست ہے کہ مرحوم کے تمام خطوط غالب لائبریری کو عطا کریں تاکہ وہ محفوظ ہو جائیں اور آیندہ کے محققین کو تحقیقی کام کرنے میں سہولت بھی ہو ۔ ایک خط (مورخہ ۷/ اپریل ۱۹۵۹ء) سید سبط حسن کے نام ہے اور اُن ہی سے غالب لائبریری کو ملا بھی ہے ۔ اس میں مرحو کے مقالے (پاکستان کا نظامِ تعلیم) کی لیل و نہار کے سال نامے میں اشاعت کا ذکر ہے ۔ دوسرا خط (مورخہ ۲/ ۱۹۶۱ء) جنابِ داغ کے مقدمے نوشتہ سید سبط حسن کی بابت ہے ۔ یہ خط بھی سبط حسن ہی کا عطیہ ہے ۔ ا کی امتیازی خصوصیت مرحوم کا وہ بے لاگ تبصرہ ہے جو انھوں نے سبط حسن کے اُس وقت کے طبع شدنی مقد پر کیا ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "اپنے اصل موضوع سے کسی قدر بے تعلق ہے"۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔ "یہ غیر متناسب معلوم ہوتی ہے اور قارئین کو یقیناً کھٹکے گی"۔ ایک اور جگہ اس طرح اظہار خیال کیا ہے ۔ "موجو صورت میں یہ مقالہ (بہت خوب ہونے کے باوجود) کسی اور موضوع پر لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے"۔

میں نے یہ دو تین مثالیں محض یہ بتانے کی خاطر نقل کی ہیں کہ حمید احمد خاں علم اور صاحبِ علم دونوں معاملے میں راست باز اور صاف گو تھے ۔ انھیں جو باتیں کھٹکیں وہ بلا کم و کاست لکھ دیں ۔ ہم عصر اور ایک معرو ادیب کی تحریر پر خیال آرائی کرتے وقت نہ اپنے ذاتی مراسم کو سدِّ راہ بننے دیا اور نہ کسی جھجک اور رعایت سے کام لیا تنقید اور تبصرے کی یہ شرط اوّل ہے اور راست گو نقاد ہی ایسی شرط پوری کرتا ہے ۔ فی زمانہ نقاد بہت اور راست کم ہیں ۔ حمید احمد خاں، جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے ایک بے باک نقاد تھے ۔

دو خطوط کا سرسری ذکر کرنے کے بعد اب مرحوم کے اُن آٹھ خطوط کا پس منظر بیان کرنا چاہتا ہوں جو ہم نے احتیاط کے ساتھ غالب لائبریری میں محفوظ کر لیے ہیں ۔ ادارۂ یادگار غالب جنوری ۱۹۶۸ء میں قایم ہوا ۔ ادا

پہلی عام تقریب "تماشائے اہلِ کرم" بدھ ۲۰ر نومبر ۱۹۶۸ء کو آدم جی سائنس کالج ہال، کراچی میں غالب پنسل کی فروخت سے روپیہ جمع کرنے کے لیے فیض احمد فیض کی صدارت میں منعقد کی گئی۔ حفیظ ہوشیارپوری مرحوم نے س تقریب کی تاریخ اس طرح نکالی تھی۔

چلے بیچنے "غالبی پنسلیں" 　　جو دیکھا تماشائے اہلِ کرم
ہوئے جمع نقدِ دل و جاں لیے 　　بر آئی تمنائے اہلِ کرم
جو تقریب برپا ہوئی اُس کا سال 　　ہے "ذکرِ تماشائے اہلِ کرم"
　　　　　　　　　　　　　　　　۱۹۶۸ء

دوسرے ہی مہینے یعنی ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو ادارے کی پہلی خاص تقریب پروفیسر حمید احمد خاں کی صدارت میں کی گئی جس میں کراچی کے بیشتر ممتاز ادیبوں شاعروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ فروری ۱۹۶۹ء میں صد سالہ برسی کی جانے والی تھی اور اس وقت تک پروگراموں کا خاکہ مرتب کیا جا چکا تھا جس میں سات کتابوں کی اشاعت مشاعرہ، محفلِ موسیقی اور نمائشیں وغیرہ شامل تھیں۔ میں نے یہ پروگرام بناتے ہوئے ادیبوں سے تعاون کی اپیل کی اور مشورے طلب کیے۔ جیسا کہ نسیم درّانی نے روزنامہ جنگ مورخہ ۷ر جنوری ۱۹۶۹ء میں لکھا تھا۔ عالی صاحب (مرزا جمیل الدین عالی) حال ہی میں ادیبوں کے ایک وفد کے ساتھ کئی ملکوں کا دورہ کرکے آئے ہیں۔ ن ممالک میں حکومتوں کے زیرِ اہتمام غالب کی صد سالہ برسی پر ہونے والے اشاعتی اور دیگر پروگراموں کے متعلق و معلومات حاصل کی ہیں۔ لیکن خود اپنے ملک میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر جو خاموشی پائی جا رہی ہے س پر عالی صاحب نے سوزشِ دل سے سخنِ گرم ادا کیا۔ انھوں نے کہا ہماری حکومت کے خیال میں غالب ہندوستانی شاعر ہے۔ اس لیے کہ وہ آگرے میں پیدا ہوا اور دہلی میں انتقال کیا اور وہیں اس کا مزار بھی ہے۔ حکومت کی بے توجہی کا ذکر کرتے ہوئے عالی صاحب نے کہا کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری دوسری زبان بنگلہ میں اس پایہ کا کوئی شاعر نہیں ہے۔ بہر حال اگر غالب صرف اردو فارسی کے شاعر تھے تو کم سے کم حکومتِ مغربی پاکستان ہی کو غالب کی صد سالہ برسی کے لیے سرکاری سطح پر کوئی ٹھوس قدم اٹھانا چاہیے ...... یہ معاملہ اندرونی پیچیدگی یا جمہوری اقدار کے ہونے یا نہ ہونے کا نہیں ہے، بلکہ یہ خالص ادبی معاملہ ہے اور حکومت تک یہ بات پہنچانے کے لیے انھوں نے بطور خاص مہمان خصوصی حمید احمد خاں صاحب اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کی توجہ اس جانب مبذول کرائی"۔

پروفیسر حمید احمد خاں کی صدارتی تقریر کی رپورٹ ۶ر جنوری ۱۹۶۹ء کے روزنامہ حریت میں حمید کاشمیری نے اس طرح لکھی۔ حمید احمد خاں صاحب نے فرمایا "اگر ہندوستان سرکاری طور پر غالب کی صد سالہ برسی منا رہا ہے تو ممکن ہے ہندوستان کو سرکاری طور پر اس کی ضرورت ہو، لیکن ہم سے یہ مطالبہ کرنا کہ ہم بھی غالب کو سرکاری طور پر منوائیں، درست نہیں ہے۔ ہماری سرکار کی دہلیز تک رسائی ضرور ہے۔ لیکن شنوائی نہیں۔ ہم صرف دستک دے سکتے ہیں۔ غالب کا سا اندازِ بیان اور اس کی ہمہ گیری مجھے دنیا کے کسی اور شاعر میں نظر نہیں آئی۔

میں نے "دنیا میں" اس لیے کہا ہے کہ انگریزی زبان کے ذریعہ دنیا کے کم و بیش ہر بڑے شاعر کو پڑھنے اور سمجھنے کا مجھے موقعہ ملا ہے۔ لیکن غالب والی بات کہیں اور نظر نہ آئی۔ غالب ہماری ایک ہزار سالہ تہذیب کا نمایندہ اور اقبال کا پیش رو تھا۔ اُس کی عظمت سے انکار کرنا اسلاف کو بھولنا اور اپنی تہذیب سے انکار کرنا ہے۔ غالب کی قدر وہی کر سکتا ہے جس نے غالب کو سمجھا ہو۔ اور جس نے غالب کو سمجھا ہی نہیں اُسے ہم مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ غالب کی قدر کرے۔ ایسے ناقدر شناس کا چُپ ہی رہنا غالب کے حق میں مفید ہے۔ غالب ہی کا شعر ہے ؎

مجبوریٔ و دعوائے گرفتاریٔ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

اعتراف یا اعتقاد یا قدردانی میں ہم جبر کے قائل نہیں۔ کسی کا ہاتھ بھاری پتھر کے نیچے دبا کر، یا شکنجے میں کس کر اس سے مصافحہ کیا جائے اور پھر یہ اعلان ہو کہ دیکھیے کیسی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا جا رہا ہے۔ محض ایک دھوکہ ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کا چپ ہی رہنا بہتر ہے جو غالب کے قدردان نہیں ہیں۔ ہمیں کسی سے مالی امداد نہیں مانگنا چاہیے۔ ہم غالب پنسلیں بیچ کر غالب کی صد سالہ برسی کا شاندار اہتمام کر لیں گے۔"

اسی صدارتی تقریر میں غالب کے آگرے میں پیدا اور دلّی میں دفن ہونے کے تعلق سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے مرحوم نے فرمایا اگر پیدایش اور دفن کے مقامات کو ملحوظ رکھا گیا تو خاکِ ہند میں سونے والی بے شمار ہستیوں، بزرگوں اور ملّی زندگی کے محسنوں سے رشتہ توڑ دینا ہوگا۔ مگر اس کے بعد بھی بات اور آگے بڑھے گی اور وہ یہ کہ ہم حجاز کی سرزمین سے اٹھنے والے اور وہیں انتقال فرمانے والے اُس داعیٔ حق سے اپنا تعلق کس طرح قایم رکھ سکیں گے کیونکہ وہ بھی تو اس جغرافیائی خطۂ ارض میں تولد نہیں ہوئے جسے اب پاکستان کہتے ہیں، اور نہ آپ کا روضۂ مبارک یہاں ہے۔

فروری ۱۹۶۹ء کی ابتدائی تاریخوں میں اُس وقت کی سیاسی افراتفری کے پیشِ نظر طے کیا گیا۔ کہ صد سالہ برسی مارچ میں منائی جائے۔ مشاعرے کی صدارت کے لیے حمید احمد خاں صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ میں نے موصوف کو خط لکھا کہ ادارے کی درخواست قبول فرمائیں۔ آپ نے فوراً جواب ارسال کیا کہ "۸ مارچ کو منعقد ہونے والی تقریب میں میری شرکت، میرے لیے باعثِ فخر و مسرت ہوتی۔ لیکن مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بہ حالاتِ موجودہ میرا لاہور کے باہر جانا ناممکن ہوگا۔ براہِ کرم میری معذرت قبول فرمائیے اور ارکانِ ادارۂ یادگارِ غالب کی خدمت میں بھی میرا شکریہ پہنچا کر موجودہ صورتِ حال میں کراچی کا سفر اختیار کرنے کے معاملے میں میری معذوری کا اظہار کر دیجیے۔" ادارۂ یادگارِ غالب کے معاملات کے سلسلے کا یہ پہلا خط تھا۔ اور بہ خطِ حمید احمد خاں۔

ملک کے سیاسی حالات بگڑتے ہی چلے گئے اس لیے صد سالہ برسی مارچ میں نہ کی جا سکی اور طے ہوا کہ ماہِ مئی میں کریں۔ ختم مارچ پر اپنے سرکاری کام سے لاہور گیا، مرحوم سے ملا اور انھیں ادارے کے اشاعتی پروگرام سے آگاہ کیا۔ خیال یہ تھا کہ ادارۂ یادگارِ غالب اور جامعہ پنجاب کی مطبوعات میں کوئی ایسی کتاب شامل نہ ہو جائے جو دونوں کی طرف سے شایع ہو۔ باہمی تبادلۂ خیال اور تعاون ہی طرفین کے وقت، توانائی اور روپے کے ضیاع کو روک سکتے تھے۔ چنانچہ حمید احمد خاں صاحب نے مجھ سے اتفاق فرمایا کہ جامعہ پنجاب اپنے پروگرام میں پنج آہنگ کے خطوط کا ترجمہ

شامل نہیں کرے گی جو ہمارے ادارے کی جانب سے محمد عمر مہاجر کر رہے تھے اور ہم غالب کی کسی اور فارسی تخلیق پر کوئی کتاب شایع نہیں کریں گے۔ اُسی ملاقات میں میں نے مرحوم کو بتایا تھا کہ اب صد سالہ برسی کی تقریبات ۷ رمئی سے شروع ہوں گی، مشاعرہ پہلے ہی دن ہوگا اس لیے صدارت کے لیے کراچی تشریف لائیں۔

کراچی لوٹنے کے بعد جب پروگرام کو آخری شکل دی گئی تو مشاعرے کی تاریخ ۷ رمئی کی بجائے ۹ رمئی مقرر ہو گئی۔ چنانچہ میں نے اس تبدیلی کی اطلاع بھیجی تو حمید احمد خاں صاحب نے جواب میں لکھا۔ "اس ترمیم سے میرے لیے ایک مشکل سی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ میں نے اِس دوران میں مرکزی ترقیٔ اردو بورڈ (لاہور) کا جلسہ ۱۰ رمئی کی صبح کو مقرر کر دیا تھا، اس امید پر کہ ۶۔۷ رمئی کو کراچی جا کر ۹ رمئی کی شام تک واپس لاہور پہنچ جاؤں گا۔۔۔۔۔ میں مرکزی اردو بورڈ کے جلسے کی تاریخ بدل دیتا، مگر یہ تاریخ پہلے ہی دو دفعہ بدل چکی ہے اور اب بورڈ کے ارکان مزید تبدیلی پر خوش نہ ہوں گے۔

"اگر آپ کے ادارے کی تقریبات کا آغاز کسی اور تاریخ سے بہ سہولت ممکن ہو تو میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر تاریخ کی تبدیلی ممکن نہ ہو سکی تو امید ہے کہ آپ میری معذرت قبول فرمائیں گے۔" مرحوم کا یہ دوسرا خط تھا۔

میں نے صورتِ حال جناب فیض احمد فیضؔ کو بتائی اور ادارے کے سرگرم کارکن پیر حسام الدین راشدی کو بھی۔ دونوں نے کہا ایک اور خط لکھو اور اصرار کرو کہ موصوف جس طرح بھی ممکن ہو ضرور آئیں۔ چنانچہ میں نے دوسرا خط لکھا کہ آپ جیسے غالب شناس اور غالب دوست کی عدم حاضری سب کے لیے باعثِ رنج ہو گی۔ تین دن کے اندر جواب آیا کہ "بصورت موجودہ اس فیصلے میں ترمیم کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ ضمناً یہ وضاحت کر دوں کہ بورڈ کے اجلاس کی تاریخِ انعقاد ممتاز حسن صاحب ہی کی فرمائش پر ۳ رمئی کے بجائے ۱۰ رمئی مقرر کی گئی تھی اور اب تیسری مرتبہ تاریخ کی تبدیلی بورڈ کے اکثر ارکان کو نامناسب معلوم ہو گی۔

مجھے اندریں حالات اپنی طرف سے مکرر معذرت بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ اس موقع پر آپ کی اور کراچی کے دوسرے احباب کی ملاقات سے محروم رہنا خود میرے لیے باعثِ افسوس ہے۔ یار زندہ و صحبت باقی کہہ کر دل کو تسلی دے رہا ہوں۔"

اشتیاق دونوں طرف تھا۔ ہمیں بلانے کا۔ حمید احمد خاں صاحب کو غالب کی تقریبات میں شرکت کرنے کا۔ دونوں کی اپنی اپنی مجبوریاں بھی تھیں۔ ہماری یہ کہ ایک تقریب میں کوئی تبدیلی کریں تو اس سے بقیہ پانچ تقاریب اور اُن تقاریب کی وجہ سے ڈھاکہ، ملتان، لاہور، راولپنڈی اور پشاور سے آنے والے مقررین، صدور اور فن کاروں کے پروگرام متاثر ہوتے۔ خاں صاحب کی مجبوری یہ تھی کہ مرکزی اردو بورڈ کا اجلاس بار بار بدلنا بورڈ کے اراکین کے لیے باعثِ زحمت ہو رہا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ ٹیلی فون پر طے ہوا کہ اگر مشاعرہ ۹ رمئی کی بجائے ۱۰ رمئی کو کیا جائے تو موصوف صبح بورڈ کے اجلاس میں شرکت کر کے شام کے ہوائی جہاز سے کراچی آ جائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ تشریف لائے مشاعرے کی صدارت اور دوسرے دن کی تقریبات میں شرکت کی اور پھر ادارۂ یادگارِ غالب کی کتاب الرّائے میں لکھا:

"ارکانِ ادارۂ یادگارِ غالب کا خلوص و ہمت سزاوارِ صد تحسین و آفرین ہے کہ ما لی

وسائل کی کوتاہی کے باوجود، اور حکومتِ پاکستان کی پشت پناہی کے بغیر انھوں نے پاکستان کی قومی زبان اردو کے سب سے بڑے شاعر کو اُس کی صد سالہ برسی کے موقع پر شایانِ شان طریقے سے یاد کیا۔ اس طرح انھوں نے پاکستان کی ذہنی شائستگی اور ملک وقوم کی ہزار سالہ روایات کی لاج رکھ لی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب کی انسانی عظمت کا اعلان امریکہ اور انگلستان، روس اور ہندوستان، جیسے ممالک میں اس دھوم دھام سے ہوا کہ اگر پاکستان یادِ غالب کی ان تقریبات کے جلوس کو گونگی زبان اور بے بصر آنکھوں سے دیکھتا رہتا تو نہایت شرم کا مقام ہوتا۔ اس نازک مرحلے پر کراچی کے چند صاحبِ ذوق اور محبِ وطن افراد جنھیں سرکار دربار میں رسائی نہ تھی خدا کا نام لے کر اٹھے اور غالب کا ذکر کر کے (جو در اصل تہذیبِ پاکستان کا ذکر تھا) پوری قوم کی زبان بن گئے۔

اس ادارے کے کس کس کارنامے کو سراہا جائے! متعدد تقریبات اس اہتمام سے برپا کیں کہ ایک دنیا نے اُن کی گونج سُنی۔ تصویروں کی نمایش اس شان سے منعقد کی کہ غالب ایک بار پھر زندہ ہوا اور وہ مصور[1] جس نے اپنے شاہکار اس موقع پر پیش کیے خود زندہ تر ہو گیا۔ مگر سب سے بڑھ کر تحقیقی اور تشریحی کتابوں کا وہ سلسلہ تھا جس کی اشاعت نے ثابت کر دیا کہ حالات کتنے ہی ناسازگار رہوں، پاکستان اپنی تہذیب و تمدن کے محسنوں کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتا۔

پاکستان زندہ باد، ادارۂ یادگارِ غالب پایندہ باد۔"

آخر میں حمید احمد خاں مرحوم کی ایک اور تحریر کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ بھی غالب لائبریری میں محفوظ ہے۔ لائبریری کا افتتاح یکم ستمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔ ہم نے یکم سے ۷ ستمبر تک "ہفتۂ مطالعۂ عبدالحق" منایا۔ مطلب یہ تھا کہ اس مدت میں بابائے اردو کی تحریروں اور خود ان پر لکھے ہوئے مضامین اور کتابیں اس طرح ترتیب دی جائیں کہ اُس ہفتے کے قارئین کو آسانی سے مل جائیں۔ اس سلسلے میں ادارے کے سرگرم اور مخلص کارکن سحر انصاری نے ایک مختصر کتاب "ذکرِ غالب، ذکرِ عبدالحق" مرتب کی جس میں مولوی صاحب کے دو مضامین کے علاوہ اُن تین سو مضامین کا اشاریہ بھی شامل ہے جو غالب لائبریری میں موجود ہیں۔

میں نے یہ کتاب مرحوم کو بھیجی تو مجھے خط لکھا:-

"آفرین ہے آپ کو مولوی صاحب کی دسویں برسی پر آپ نے سحر انصاری صاحب کے اعجازِ ترتیب سے پُر لطف کام لیا اور مولوی صاحب کی یاد کو مرزا غالب کی یاد سے ملا دیا ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

اب یہ آپ کی نکتہ سنجی کا کمال ہے کہ آپ یہ بتا دیں کہ ذکرِ غالب، ذکرِ عبدالحق میں سرِّ دلبراں ذکرِ عبدالحق ہے یا ذکرِ غالب؟ اور حدیثِ دیگراں ذکرِ غالب ہے یا ذکرِ عبدالحق؟"

بزمِ غالب کے دو چراغ — مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام — کچھ ہی مدت پہلے گُل ہوئے تھے کہ حمید احمد خاں کی موت نے اس کی محفل کی ایک اور شمع کو خاموش کر دیا۔ اب کہاں پیدا ہوں گے ایسے لوگ؟ —

---

[1] صادقین جنھوں نے پچاس تصویریں بنائی تھیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

حمید احمد خاں

۲۲ مارچ کو وہ دیوقامت علمی شخصیت موت سے ہم کنار ہوگئی جس کی زندگی ایک مسلسل ریاض اور جہاد سے عبارت تھی۔ ایک نتھری ستھری پاکیزہ زندگی، بے داغ بلکہ چمکتا دمکتا اور جگمگاتا کردار، نمونہ رہا شاگردوں کے لیے روشنی کا مینار، علم کی نت نئی راہوں کی دریافت میں عشق وجنون کے جملہ لوازم کا منظہر، خلوص اور دیانت اور وفا کا پتلا: یہی وہ خوبیاں ہیں جو استاذی گرامی قدر پروفیسر حمید احمد خاں کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

میرے نزدیک حمید احمد خاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے قول و فعل میں کبھی تضاد نہ اُبھرا۔ ان کا کردار نہایت بلند تھا۔ علمی، ادبی اور تعلیمی مسائل پر ان کی آرا نہایت جچی تلی ہوتی تھیں۔ وہ اصول کے معاملے میں کسی مصالحت اور کسی مصلحت بینی کے قائل نہیں تھے۔ اس کی خاطر انھوں نے بہت نقصان اٹھایا۔ بعض افراد کے سب و شتم کے شکار ہوئے۔ عافیت کوش احباب نے راستے میں لچک کے مشورے دیے۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے مسلک اور موقف پر چٹان کی طرح قایم رہے۔ لاریب آج کے معاشرے میں ایسی شخصیات چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں تو نہیں پائیں گے۔

حمید احمد خاں ایک مثالی استاد تھے۔ میں اسلامیہ کالج میں ان کا شاگرد تھا اور سچ پوچھیے تو اُنتالیس سال تک شرفِ تلمذ سے فیضیاب ہوتا رہا۔ اور خوبیٔ تقدیر ملاحظہ ہو کہ ان کی جان لیوا بے ہوشی سے صرف دو گھنٹے پہلے میں نے ٹیلی فون پر ان سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر لیا۔ دوسری باتوں کے علاوہ انھوں نے اس دن کے "لاہور نامہ" (انتظار حسین) کا تذکرہ بہت دلچسپ انداز میں کیا۔ حمید احمد خاں کو اپنے نمونہ رہا شاگردوں سے پیار تھا اور شاگرد بھی ان پر جان دیتے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ اسلامیہ کالج سے وابستہ رہے۔ پہلے استاد کی حیثیت سے، پھر پرنسپل کی حیثیت سے انھوں نے طلبا پر شفقت کی دولت نچھاور کی۔ بہت سے طلبا کو مالی امداد دی۔ جسے سردیوں میں ناکافی لباس میں دیکھا اُسے چُپ چاپ اس قابل کر دیا کہ مناسب لباس پہن سکے۔ طلبا کی شکایات پر کان دھرتے تھے۔ ان کا ازالہ کرتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے تو اس دانش گاہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہفتے میں تین دن دو دو گھنٹے صرف طلبا کے لیے مخصوص کر دیے۔ اور انتظامیہ یا غیر عادل اساتذہ کے خلاف شکایات توجہ سے سنتے رہے اور اُن پر فوری اور مؤثر کارروائی

کرتے رہے۔ لیکن وہ ایک چیز ناپسند کرتے تھے۔ اور وہ تھی طلبا میں ٹریڈ یونین ازم۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ درس گاہوں میں نظم وضبط کے سلسلے میں "خاندانی تصور" کے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہر درس گاہ ایک خاندان کی حیثیت رکھتی ہے۔ طلبا اور اساتذہ اس خاندان کے افراد ہیں۔ درس گاہ کے سربراہ کا فرض ہے کہ تمام افراد کے حقوق کا خیال رکھے اور سب سے پیار کرے۔ بچے ضد کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی اُن کی ضد مانی بھی جا سکتی ہے۔ لیکن جس طرح ایک خاندان میں ہڑتال نہیں ہوتی۔ اسی طرح درس گاہ میں ہڑتال بھی ایک غلط حربہ ہے اور نہ درس گاہ میں اجتماعی سودے بازی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دور ایوبی میں اس تصور کی بدولت اور نوکر شاہی کی ریشہ دوانیوں کے سبب سے انھیں وائس چانسلر شپ سے مستعفی ہونا پڑا۔ وہ دن اور آج کا دن درس گاہوں میں ٹریڈ یونین ازم کا دور دورہ ہے اور اس کے نتائج ظاہر ہیں۔ موت سے پہلے انھوں نے اپنے تعلیمی خطبات کا ایک مجموعہ "تہذیب و تعلیم" کے نام سے مرتب کر لیا تھا جب یہ چھپ جائے گا تو شاید آج کے ارباب حکومت اور ارباب دانش اس سے روشنی اخذ کر سکیں۔

حمید احمد خان ایک ہمہ جہتی شخصیت کے مالک تھے ادب کی مختلف اصناف اور علم کی مختلف شاخوں میں انھیں اتنا ادراک حاصل تھا کہ ہر موضوع پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے۔ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ جس مجلسی تقریب کی صدارت فرماتے۔ ایک مختصر سے صدارتی خطبے میں جو باتیں کہتے وہ بھاری بھرکم مقالات سے زیادہ وزنی ہوتیں۔ یہ خوبی میں نے صرف دو بزرگوں میں دیکھی ہے۔ ایک سر شیخ عبدالقادر (جناب منظور قادر کے والد) میں دوسرے مسٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن ہیں۔

علمی تحقیق میں جس کرید اور جنون کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ حمید احمد خان میں بدرجۂ وافر موجود تھے۔ چنانچہ غالب پر تحقیق ہو یا اقبال پر انھوں نے معلومات کی جستجو میں انتہا کر دی۔ غالب پر تحقیق تو اس وقت سے جاری تھی جب ہم کالج میں پڑھتے تھے اب وہ اس پوزیشن میں تھے کہ تحقیق کے نتائج کو کتابی صورت میں پیش کریں۔ لیکن شاید قدرت کو ایسا منظور نہیں تھا پنجاب یونیورسٹی ہر سال کسی ممتاز شخصیت سے اقبال پر لیکچر کراتی ہے۔ اس سال یہ لیکچر پروفیسر حمید احمد خاں کو دینے تھے اور انھوں نے مسلسل محنت شاقہ سے کام لے کر یہ لیکچر تیار کر لیے تھے کہ موت کا بلاوا آ گیا۔

حمید احمد خاں انگریزی ادب کے استاد تھے۔ لیکن اردو زبان کو فروغ دینے میں انھوں نے پوری عمر بسر کر دی۔ بی۔ اے اور بی ایس سی میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا۔ تو انھوں نے ایم۔ اے اور ایم ایس سی میں اساتذہ کو اردو میں لیکچر دینے کا حق حاصل ہوا تو انہی کی بدولت ایم۔ اے اور ایم۔ ایس۔ سی میں طلبہ کو امتحانات کے پرچوں میں اُردو میں جواب لکھنے کا حق ملا تو انہی کی کوشش سے۔ غرض اردو کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے تعلیمی دائرے میں جتنے بڑے قدم اٹھائے گئے، اُن کا سہرا حمید احمد خان ہی کے سر ہے انہی کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کی انتظامیہ میں فائلوں پر اردو میں نوٹ لکھنے کی رسم کا آغاز ہوا۔ ایک بات اور یاد آ گئی پہلے یہ دستور تھا کہ جو لوگ نجی طور پر ڈگری حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھیں پہلے علوم شرقیہ کے امتحانات پاس کرنے پڑتے تھے اور پھر ڈگری کے لیے صرف انگریزی کا۔ حمید احمد نے بندوبست کر دیا کہ لوگ تمام غیر پیشہ ورانہ امتحانات پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کرنے لگے، اس سے ان لوگوں پر بھی تعلیم کے دروازے کھل گئے جو کسی درس گاہ میں داخلہ لینے اور اس کے مالی لوازم پورے کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اردو زبان سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ زیادہ تر نجی گفتگو بھی اردو میں کرتے اور بچوں کو بھی اردو کی تربیت ایسی دے رکھی تھی کہ جب بھی کوئی ٹیلیفون کرتا اور کوئی بچہ ریسیور اٹھاتا تو فوراً آواز آتی چھ پانچ پانچ سات سات، یہ رسم میں نے اور کسی کے ہاں نہیں دیکھی۔

وارث میر

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم

پروفیسر حمید احمد خاں "ایک گھیٹ استاد" تھے ایک ایسے استاد جو ذہن جدید اور قلب قدیم کے گوناگوں محاسن کا امتزاج تھے۔ انگریزی زبان وادب کے گہرے مطالعے اور کیمبرج یونیورسٹی سے ایم لٹ ہونے کے باوجود ان کی مشرقی شخصیت اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑی رہی۔ وہ انگریزی لباس پہنتے اور ضرورت پڑنے پر بڑی عالمانہ انگریزی میں تقریر بھی کرتے تھے لیکن "مغربیت" کی ایک بوند بھی ان کی دل کی دنیا تک نہ پہنچ سکی تھی۔ وہ جذباتی وابستگیوں اور ناوابستگیوں کے قائل تھے۔ ان کی پسند اور ناپسند ہمیشہ شدید ہوتی تھی۔ شعلہ بھی تھے اور شبنم بھی۔ دوستگی اور ناخفگی کے اظہار میں ریاکار نہیں تھے۔ ڈپلومیسی اور مصلحت شناسی کے "جوہر" سے کلیتًا محروم تھے۔ عملی زندگی میں یہی ان کی خوبی تھی اور یہی ان کی کمزوری۔ اس خصوصیت کی بنا پر وہ اپنے دوستوں میں محترم اور باوقار تھے اور اسی کمزوری کی بنا پر وہ حاکموں کے اعتماد کو زیادہ عرصہ تک نبھا نہیں سکتے تھے۔ اسلامیہ کالج کی پرنسپلی کے زمانے میں ایک کامیاب منتظم کے طور پر بہت نیک نام ہوئے۔ یونیورسٹی میں وائس چانسلر ہو کر آئے تو ان کے مخصوص تعلیمی نظریات اور انتظامی رویہ پر طلبہ کی طرف سے سخت گیری کا الزام لگایا گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اسلامیہ کالج کا ایک متعین مزاج اور روایات تھیں۔ آپ نے اس ادارے کو اس کے مزاج اور روایات کی روشنی میں کامیابی سے چلایا اور تعلیمی و حکومتی حلقوں میں اپنی صلاحیتوں کی دھاک بٹھائی۔ یونیورسٹی کی وائس چانسلری بنیادی طور پر ایک سیاسی عہدہ تھا۔ یہاں انھیں طلبہ، اساتذہ اور حکومت کے پیچ در پیچ سیاسی مفادات کے باہمی تصادم کا سامنا کرنا پڑا۔ مزاجًا سیاست داں یا ڈپلومیٹ نہیں تھے سیدھے کھرے اور شریف النفس "استاد منتظم" تھے۔ اور استاد کا منصب بہت سی خوبیوں کے علاوہ ایک کمزوری کا حامل بھی ہے کہ اس پیشے سے وابستہ شخص ہر فرد سے شاگردوں جیسی اطاعت کا طلبگار رہتا ہے۔ آپ عملے سے تعاون، اصول پسندی اور فرض شناسی کے جس معیار کے خواہاں تھے وہ نہ ملتا تو اکثر جھنجھلا اٹھتے۔ اور یونیورسٹی کے بڑے سے بڑے افسر کو سب کے سامنے جھاڑ پلا دیتے اور پھر فورًا ہی تالیف قلب کے لیے بھی تیار ہو جاتے تھے لیکن اپنے سے بڑے حاکم یا افسر کو ناراض کر لیتے تو اُسے منانے کا "فن" وہ نہیں جانتے تھے۔ وائس چانسلری کے ابتدائی زمانے میں انھیں طلبا کے خوفناک ہنگاموں کا سامنا کرنا پڑا۔ پرانے یونیورسٹی کیمپس کے سامنے پولیس اور طلبہ میں خشت باری کا زبردست مقابلہ ہوا۔ صورتِ حال قابو میں نہ آسکی تو پولیس نے یونیورسٹی کے اندر گھس کر طلبہ کی پٹائی کی۔ طلبہ نے وائس چانسلر سے احتجاج کیا۔ حمید احمد خاں نے وائس چانسلر کی اجازت کے بغیر یونیورسٹی کیمپس میں پولیس کے گھس آنے کی مذمت کی۔ اس وقت کے گورنر مغربی پاکستان ملک امیر محمد خاں، پروفیسر صاحب سے سخت ناراض ہو گئے اور جب تک حمید احمد خاں وائس چانسلر رہے، ملک صاحب نے یونیورسٹی کے کسی کانووکیشن میں شرکت نہ کی۔ یونیورسٹی میں ان کی نمایندگی ملک خدا بخش بچہ کیا کرتے تھے۔ ملک امیر محمد خاں وضعدار دشمن تھے انھوں

نے اپنی ناراضی کو آخر وقت تک قایم رکھا۔ لیکن اس ناراضی کو وائس چانسلر کی برطرفی کا بہانہ نہیں بنایا۔ حمید خاں نے اپنی وضعداری یوں نبھائی کہ ملک صاحب نے گورنری سے استعفادیا تو سب سے پہلے آپ نے انھیں ایک محبت بھرا خط لکھا۔ جنرل موسےٰ نے بحیثیت چانسلر کانووکیشن ایڈریس انگریزی کی بجائے اردو میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔ تو حمید احمد خاں نے ان کے بغیر ہی اس تقریب کا انعقاد کیا، اور یوں نئے چانسلر کی بھی ناراضی مول لے لی۔

حمید احمد خاں اسلامیہ کالج میں پرنسپل تھے۔ فدا حسن چیف سیکریٹری تھے۔ پرنسپل کی اجازت کے بغیر کالج کے ہوسٹل میں پولیس گھس آئی تو حمید احمد خاں نے چیف سکریٹری کو نہایت سخت احتجاجی خط لکھا۔ جواب میں چیف سکریٹری نے معذرت طلب کی۔ پروفیسر صاحب نے دونوں خط نوٹس بورڈ پر چسپاں کر دیے۔ اپنے کالج کی عظمت کے احساس سے خود سرشار تھے، اور طلبہ کو بھی سرشار رکھتے جب کبھی انسانی قدروں کے احترام میں (مثلاً لومبا کے قتل پر) طلبہ نے جلوس نکالا تو کالج کا جھنڈا حمید احمد خاں نے خود طلبہ کے ہاتھ میں تھمایا۔ مجلس ترقی ادب کے ڈائرکٹر کی حیثیت میں آپ نے سکریٹریٹ میں ڈپٹی سکریٹری یا جائنٹ سکریٹری کی سطح کے لوگوں کے دفتر میں حاضری دینے سے یہ کہہ کر ہمیشہ انکار کیا کہ میں ایک ادبی و تحقیقی ادارے کی کارکردگی کے سلسلے میں چھوٹے موٹے سرکاری افسروں کا مشورہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ وہ اس گئے گزرے دور میں علم کی غیرت کا نشان تھے۔ گزشتہ سال ہیلی کالج آف کامرس کے سالانہ جلسہ میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے آپ نے جس دردمندی سے پاکستان بنانے والی نسل کی ناکامیوں اور حسرتوں کا ذکر کیا اور جس جرأت اور حوصلے سے "سچ بولنے" کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے نئی نسل کو خواب غفلت سے جھنجھوڑنے والی باتیں کیں۔ اس سے ان کے مقاصدِ پاکستان سے بے پناہ محبت کا اظہار ہوتا تھا۔ جلسے میں موجود اساتذہ اور طلبہ کو تشویش تھی کہ خاں صاحب جذبات سے مغلوب ہو کر کہیں اپنی ملازمت سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ دو ماہ پیشتر مجلسِ ترقی ادب کی ایک تقریب میں صوبائی وزیر تعلیم کرسی صدارت پر بیٹھے تھے۔ خاں صاحب نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال سے وابستہ پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بڑے زور شور سے اور بار بار حکومت اور اہلِ پاکستان کو شجرِ اسلام سے پیوستہ رہنے کا مشورہ دیا۔ محفل میں شریک اکثر بزرگ فکرمندی سے سرگوشی کر رہے تھے "یہ خاں صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ اس حکومت کے وزیروں کے سامنے اسلام کا ذکر اتنی عقیدت سے کر رہے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ یہ لوگ تو اس لفظ کو اپنی چڑ سمجھتے ہیں اور خاں صاحب بار بار اسی لفظ کا ہتھوڑا چلا رہے ہیں۔

کالج کے زمانے میں حمید احمد خاں کی شخصیت کا طرۂ امتیاز طلبہ میں ان کا احترام تھا۔ ان کے ناقدوں کا کہنا ہے کہ یونیورسٹی میں آپ طلبہ سے اس لیے شکست کھا گئے کہ آپ کا رویہ آمرانہ تھا۔ لیکن مرحوم کے متعلق یہ رائے قایم کرنا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ استاد اور شاگرد کے رشتوں کی تیزی سے بدلتی ہوئی نوعیت اور سیاسی خلفشار سے جنم لینے والی بداعتمادی کے ساتھ خاں صاحب کے اصول ذہنی طور پر سمجھوتہ نہ کر سکے، ورنہ ان کے متعلق ایسے کئی واقعات سننے میں آئے ہیں، کہ کسی گستاخ طالب علم کو سزا دینے کے فوراً بعد ان کا دل پسیج جاتا اور وہ اس کی فیس معاف کرنے کے علاوہ کتابیں تک مفت خرید دیتے۔ وائس چانسلری کے زمانے میں جن چپراسیوں اور ڈرائیوروں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے، وہ ان کی درویشی طبعی، احترام آدمیت اور غریب پروری کی کئی داستانیں سناتے ہیں۔ اور یہ دل خراش نظارہ تو کئی اساتذہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ طلبہ بپھرے ہوئے ان کے دفتر میں داخل ہوئے کھڑکیوں کے شیشے اور فرنیچر توڑ دیا۔ پردے پھاڑ ڈالے اور خاں صاحب

کے سامنے پڑی میز پر چڑھ کر ناچتے کودتے اور نعرے لگاتے رہے ۔ اس طوفان بدتمیزی کا خاں صاحب نے کمال تحمل سے سامنا کیا، کسی لڑکے کو کچھ نہیں کہا اور اپنے چہرے کو ہتھیلی پر جمائے خاموشی کے ساتھ کرسی پر بیٹھے رہے ۔ لڑکے تھک ہار کر چلے گئے تو آپ کرسی سے اٹھے ۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں اور پھٹے ہوئے پردوں کو جمع کیا ۔ ہنگامے میں پیش پیش چند طالب علموں کے والدین کو بلایا اور ان سے گذارش کی "بچے میرے دفتر کا یہ حال کر گئے ہیں ۔ یونیورسٹی میں یہ میرے بچے ہیں ان کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے ۔ لیکن گھروں میں ان کی حفاظت کرنا اور قابو میں رکھنا آپ کا فرض ہے " شہر میں طلبہ کے جلوس پر لاٹھی چارج ہوا تھا ۔ گولی چلی تھی، اور ایسے مخدوش حالات میں وائس چانسلر کو اپنی جان کی خیر منانی چاہیے تھی ۔ لیکن طلبہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ ان کا "حریف" حمید احمد خاں وائس چانسلر شام کے وقت اپنی بیگم کے ہمراہ انارکلی میں بڑے سکون کے ساتھ شاپنگ میں مصروف ہے ۔

پروفیسر حمید احمد خاں نے اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں علمی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں بہت دلچسپی لی ۔ اور یونیورسٹی میں متعدد تحقیقی اداروں (خاص طور پر شعبہ تاریخ ادبیات) کو قایم کیا ۔ ریسرچ جرنل اور یونیورسٹی کرانیکل کا اجرا کیا ۔ سماجی یا سائنسی علوم سے متعلقہ ہر اجلاس میں بہ نفس نفیس شرکت کرتے اور شرکت سے پیشتر بڑے اہتمام سے ایجنڈے کے مختلف نکات پر تیاری کرتے ۔ ہر فائل خود پڑھتے اور فیصلوں کو دفتری بھول بھلیوں کا شکار ہونے سے بچاتے ۔ مہینے میں ایک بار مختلف شعبوں کا چکر لگاتے اور ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ۔ پروفیسر صاحب کو یونیورسٹی میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کو دوسروں سے الگ منفرد اور باوقار دیکھنا پسند کرتے تھے ۔ چنانچہ ان کے عہد میں ہر طالب علم اور استاد کے لیے سیاہ گون پہننا لازمی تھا ۔ یونیورسٹی کی طالبات کو بعض اخلاقی حدود کا پابند رکھنے کے سلسلے میں وہ کسی نرمی یا رورعایت کے روادار نہ تھے ۔ یونیسکو کی دعوت پر ترکیہ کا دورہ کر کے واپس آئے تو یونیورسٹی میں اپنے رفیقانِ کار کو بلا کر پوری روداد سفر سنائی اور ترکیہ میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک ذمہ دار افسر کی شراب نوشی اور خرمستیوں کا ذکر کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ پاکستانی سفارت خانوں کو ایسے افسروں سے نجات دلائی جائے جو بیرونی ممالک میں قوم کی رسوائی کا باعث بنتے ہیں ۔ اسلامی ممالک کی ایک کانفرنس میں پاکستان کی نمایندگی کر کے واپس آئے تو مسئلہ کشمیر کے بارے میں عربوں کی بے حسی اور غیر ہمدردانہ رویے پر اخبارات میں باقاعدہ بیان چھپوا دیا اور دوستوں کی اس رائے پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ حمید احمد خاں اور سیاست دو مختلف چیزیں ہیں ۔

پنجاب یونیورسٹی کے نظام درس و تدریس میں ۔ اردو کو اس کا جائز مقام دینے کا سہرا پروفیسر حمید احمد خاں کے سر بندھا ہے ۔ سنڈیکیٹ نے اساتذہ کو ایم ۔ اے کی سطح پر ہر مضمون اردو میں پڑھانے کا اذن عام دیا، اردو کو ذریعہ اظہار بنانے والے اساتذہ آپ کو محبوب رہے اور اکثر محفلوں میں ایسے اساتذہ کی تعریف کرتے، دفتری کاغذات پر اکثر اردو میں نوٹ لکھتے اور اپنے عملے کو بھی ترغیب دیتے کہ غلط انگریزی میں خط ڈرافٹ کرنے سے بہتر ہے کہ اردو میں خط و کتابت کی جائے، ان کے تعلیمی نظریات ملی مقاصد کے فروغ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اسی لیے ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ جب تک فلسفہ، سائنس، تاریخ اور دوسرے سماجی علوم کی تدریس انگریزی زبان کی قید سے آزاد نہیں ہوتی، قوم کی تخلیقی شخصیت کا اظہار نہیں ہو سکتا، کیمبرج میں انھوں نے ورڈزورتھ پر تحقیقی کام کیا تھا، لیکن ان کی علمی دلچسپیوں کا مرکز غالب، حالی اور اقبال کا فن تھا ۔ حالی اور اقبال کے کلام سے ملی مقاصد سے حمید احمد خاں کی محبت و عقیدت کو مستحکم کیا، اور غالب کے مطالعہ نے مرحوم کی شخصیت میں شگفتگی طبع، عقلیت

اور حکمت آرائی' کی خوبیوں کو پروان چڑھایا، نسخۂ حمیدیہ اور ارمغانِ حجاز تو شایع ہو کر صاحب ذوق حضرات سے داد وصول کر چکی ہیں، لیکن آخری ایام میں مرحوم نے اقبال کی شخصیت و فن کے علاوہ غالب پر انگریزی میں بھی ایک کتاب لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔

خاں صاحب کا شمار پاکستان کی ایسی چند فاضل ہستیوں میں ہوتا تھا جنھیں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اظہار مدعا پر قدرتِ کاملہ حاصل تھی، اور اظہارِ مدعا بھی اس خوبصورتی اور سلیقہ سے کہ ہر ہر فقرے کا، ہر ہر لفظ اپنے مفہوم و معانی کی تمام نزاکتوں اور گہرائیوں پر محیط ہوتا، کوئی لفظ کم نہیں، کوئی لفظ فالتو نہیں۔ ان کی تقریر سنتے ہوئے یوں محسوس ہوتا کہ ایک فقرے کی ترتیب میں ان کے ذہن کو اتنی ہی کاوش کرنی پڑی ہوگی جتنی کاوش کہ اس ایک فقرے میں کارفرما تصور کو واضح کرنے کے لیے کسی مقالہ نگار کو کرنی پڑتی، ان کے لہجہ کا اعتماد اور آواز کا کرارا پن 'ایک ایک لفظ کو سامعین کے دلوں میں تراز و کرتا چلا جاتا۔ انھوں نے زندگی میں بے پناہ پڑھا ہے، لیکن بہت کم لکھا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے وہ عام بسیار نویسوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ فکر انگیز اور گرانقدر ہے، وہ محض لکھنے کی خاطر پڑھنے کے قائل نہیں تھے جو کچھ پڑھا ان کی شخصیت نے اسے اپنے اندر جذب کیا؛ چنانچہ علم ان کی نس نس سے پھوٹتا تھا، اور تحریری اثاثہ کم ہونے کے باوجود علم کی دنیا میں ان کا شمار خوش بختوں اور بہرہ وروں میں ہوتا تھا، خاں صاحب کی شخصیت کا ایک قابلِ ذکر پہلو ان کا بہت زیادہ حساس ہونا تھا، یونیورسٹی سے گئے تو اس بورڈ سے اپنا نام کھرچوانے کا حکم دیدیا، جس پر ماضی کے تمام وائس چانسلروں کے ناموں کی فہرست درج ہے، بڑے دکھ کے ساتھ کہا کرتے تھے۔

"طالب علموں کی خواہشات کے آگے حکومتیں اسی طرح سر جھکاتی رہیں، تو ایک دن یہ ملک ان ہی کے ہاتھوں تباہ ہوگا، علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کے تعین کے سلسلہ میں ان کے مؤقف کو حکومت نے تسلیم نہ کیا تو اسے بھی انھوں نے دل پر لگا لیا، ہر حساس اور صاحبِ دل شخص کی طرح دوستی اور تعلق خاطر کے معاملات میں خاں صاحب" برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی" کے فلسفے کے قائل تھے اور اس فلسفے کے تحت ؎

ذرے پہ کی نگاہ تو اختر بنا دیا
رفعت میں مہر و ماہ کا ہمسر بنا دیا

فیض رسانی اور سرپرستی کی اس خوبی نے ان کے بدخواہوں میں بھی اضافہ کیا، اسلامیہ کالج کے متعدد اساتذہ یونیورسٹی میں خان صاحب کی وساطت ہی سے پہنچے ہیں۔ خان صاحب پکے مسلمان تھے، لیکن اپنی معاشرتی زندگی میں وہ کتنے وسیع المشرب اور فیض رساں مسلمان تھے۔ اس کا اندازہ جنازہ میں شریک مختلف العقائد لوگوں کے غم واندوہ کو دیکھ کر ہوا، عوامی سیاست کاری کی کامیابی کے بعد بہت سے دوسرے دانشوروں کی طرح وہ اپنے مسلمان ہونے پر کبھی نہیں شرمائے، اور اسی لیے رجعت پسندوں کے ساتھی، تصور کیے گئے۔ لیکن اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے تو لاہور کا ہر قابل ذکر "عوامی دانشور" ان کے جنازہ میں شریک نظر آیا!

مقبول جہانگیر

مشرق و مغرب کی خوبیوں کا حسین امتزاج

حمید احمد خاں کو مرحوم کہتے اور لکھتے دل اور قلم دونوں کا کلیجہ کانپتا ہے۔ بظاہر کتنی زندگی تھی اُن میں اور اس زندگی میں عزم و عمل کا کتنا حسن سمٹ آیا تھا۔ جنھوں نے حمید احمد خاں کو کبھی نہیں دیکھا، اُن سے کبھی نہیں ملے، وہ کیا جانیں گے کہ کیا چیز گم ہوئی ہے۔ اس دُبلے پتلے اوسط قامت پیکرِ آب و گل میں حرارت، حرکت اور توانائی کا کتنا بڑا خزانہ پوشیدہ تھا۔ ایسا خزانہ جو کسی اچھے نصب العین اور کسی عمدہ مقصد کی خاطر صرف ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو اپنی ذات کی نفی کر کے، دوسروں کی فلاح، دوسروں کی بہبود کے لیے زندگی وقف کر دیں اور پھر اس کا صلہ بھی کسی سے نہ چاہیں، ہمارے معاشرے میں کتنے ہیں؟ دور دور تک دیکھیے پھر احساس ہوگا، کیسی قیمتی متاع ہم سے چھینی گئی ہے۔ پھر ایک معلّم کا رخصت ہو جانا اور بھی قیامت ہے۔ معلّم، جو ہمارے ہاں کمیاب ہی نہیں، نایاب ہیں بالکل ایک سچے دوست اور کیمیا اور رہنما کی طرح سارا ماتم اس کا ہے کہ ابھی تک ہم نے معلّم کو شناخت نہیں کیا کہ اس کا مرتبہ کیا ہے؟ اس کی اہمیت کتنی لازم ہے! اس کی ضرورت کیسی شدید ہے؟ اس کے احترام کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کا حق کیا ہے؟ پھر ایسا معلّم جو من کل الوجوہ انسان بھی ہو پیغمبری کے درجے سے کس قدر قریب ہے، اس لیے بھی کہ وہ پیغمبر کے علوم کا وارث ہوتا ہے۔ کیا ہر پیغمبر انسانیت و آدمیت کا کامل نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین معلّم نہیں تھا؟ مرحوم کی یہی ایک صفت اس قابل ہے کہ اس کے سامنے سرِ نیاز جھکا دیا جائے۔

یوں دُنیا اور دُنیا والے اپنے اپنے راستے پہ رواں دواں رہتے ہیں۔ حافظ واقعی لسان الغیب ہیں، کیا خوب فرمایا ہے۔

زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

کوئی آتا ہے، کوئی جاتا ہے، موت برحق ہے، ہر ایک کے لیے اس کا جو لمحہ مقرر ہے، اس میں تاخیر نہ تقدیم، لہٰذا یہ کہنا کہ کسی کی موت بے وقت ہوئی ہے محض رسمی سی بات ہے۔ ہر موت بر وقت ہے اور خدا کی حکمت و مشیت کے بالکل مطابق۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم خوش فہمی سے زندگی کو یقینی سمجھتے ہیں حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

مرحوم سے میری ملاقات کئی بار ہوئی اور ہر بار یہی تاثر رہا کہ ایک پڑھے لکھے اور شریف انسان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا اور کچھ نہ کچھ سیکھ کر ہی اٹھا۔ اوّلیں ملاقات ۱۹۶۳ء میں ہوئی جب کہ مرحوم پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اس عہدے نے اُن کے اندر رعونت پیدا نہیں کی تھی اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ان کی رگوں میں نجیب الطرفین خون دوڑ رہا ہے۔ وہ جتنی بار بھی ملے، خندہ پیشانی سے ملے۔ اپنی مصروفیت کا کوئی ذکر نہیں کیا جیسا کہ آج کل ہر بڑے آدمی کے ہاں اُس کا ذکر

کرنا فیشن میں داخل ہے۔ شام ہمدرد میں بارہا انھیں دیکھنے، اُن سے ملنے اور ان کی تقریریں سننے کا موقع ملا۔ ایک بار مرحوم شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کے ہمراہ اُن کے دولت کدے پر بھی حاضر ہوا اور دو ڈھائی گھنٹے تک نشست رہی۔ ڈھائی تین سال قبل نقاشِ فطرت حضرت میاں ایم۔ اسلم کے دولت کدے پر بھی اُن سے ملاقات ہوئی۔ اُن دنوں ملک میں عام انتخابات ہونے والے تھے اور ہر طرف ان کا چرچا تھا۔ میاں صاحب موصوف نے شام کو چائے پر جن مہمانوں کو مدعو فرمایا، اُن میں حضرت حفیظ جالندھری اور حمید احمد خاں مرحوم بھی شامل تھے۔ یہ نشست بہت پُرلطف رہی حفیظ صاحب نے اپنا تازہ کلام عطا فرمایا، کچھ باتیں سیاسی ہوئیں، کچھ ادبی۔

مرحوم کے مزاج میں لطافت، بلکہ یوں کہیے کسی قدر نزاکت تھی۔ ایسی نزاکت کہ بقول انشا ؎

نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

اس لطافت ونزاکت نے مل کر اُن کی طبیعت میں حد درجہ نفاست پیدا کر دی تھی۔ بے ڈھنگی چیز، بے ہودہ بات یا بے اُصولے پن سے اُنھیں وحشت ہوتی تھی۔ اس نفاستِ طبع اور لطافتِ مزاج کی بدولت وہ بہت سوں کی نظر میں غیر پسندیدہ شخصیت بن گئے تھے۔ بعض نزدیکانِ بے بصر کو اُن کے چہرے پر علم نظر نہیں آتا تھا۔ بعض انھیں کبر و عجب کا مریض سمجھتے تھے۔ اور چونکہ کم گویائی اُن کی فطرت تھی، لہٰذا طے کر لیا گیا تھا کہ وہ غرور و نخوت میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ وہ شبنمی انسان تھے۔ پاک، صاف، مقطر، معطر۔ جن سے اُن کا دل ملتا، اُن سے بڑھ کر ملتے۔ دو خوبیاں اُن کی نگاہ میں قابل التفات تھیں خواہ کسی میں پائی جائیں۔ شرافت اور علم۔ کسی کی شرافت کا علم ہو جاتا تو اس کی بڑی قدر کرتے۔ کوئی عالم بوسیدہ کپڑوں میں لپٹا ہوا اُن کے پاس چلا آتا، تو خندہ پیشانی سے پذیرائی کرتے اور احترام میں اس کے آگے بچھ بچھ جاتے۔ ایک مرتبہ شام ہمدرد میں میں نے دیکھا۔ ایک بہت بڑے سرکاری افسر، جو اچھے ادیب بھی ہیں، حمید احمد خاں سے باتیں کر رہے تھے۔ کہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی مرحوم اپنی درویشانہ وضع میں ان کے قریب پہنچے۔ حمید احمد خاں فوراً اُن کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور سرکاری افسر سے گفتگو قطع کر کے دیر تک شیخ صاحب مرحوم کی مزاج پُرسی کرتے رہے۔

وہ انگریزی کے پروفیسر تھے۔ انگریزی زبان اُن کا اوڑھنا بچھونا رہی، لیکن بایں ہمہ وہ اردو کے عاشق تھے۔ جب بولتے اور برجستہ تقریر کرتے تو کیا مجال انگریزی کا کوئی لفظ بھولے سے بھی زبان پر آجائے۔ انھیں اپنے لب و لہجے پر حیرت انگیز قابو تھا۔ کوئی اُن کی باتیں دل کے کانوں سے سُنتا تو اقرار کرتا کہ یہ ایک شریف اور اچھے آدمی کا لب و لہجہ ہے جس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو اور چاندنی کا نکھار ہے۔ کبھی کبھی یہ نکھار اور یہ خوشبو تلوار کی دھار بھی بن جاتی تھی۔ ایسی دھار جو فولاد اور ریشم دونوں کو یکساں صفائی سے کاٹتی چلی جاتی ہے۔

اُنھوں نے جدّ و جہد آزادی کے ایک پورے دَور کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا۔ خود اُن کے سب سے بڑے بھائی مولانا ظفر علی خاں حدی خوانوں کے اُس قافلے کے سالاروں میں سے ایک تھے، جو برِّ صغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا جلی عنوان سمجھے جاتے تھے۔ یعنی مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبالؒ، مولانا حسرت موہانی، شوکت علی وغیرہم۔ حمید احمد خاں نے ان سب شخصیتوں کو دیکھا اور اُن کا بے پناہ اثر قبول کیا تھا۔ پھر ان کو استاد بھی ایسے ملے کہ ایک ایک شخص اپنی ذات میں انجمن تھا۔ ان میں ہندو، مسلمان، اور انگریز سبھی شامل تھے۔ مولانا عبدالباری ندوی، مولانا

مناظراحسن گیلانی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ریورنڈ ٹامس گریم بیلی، پروفیسر مدن گوپال سنگھ، پروفیسر لینگ ہارن اور ڈاکٹر ویلیٹی۔
حمید احمد خان کی عمر چھ سال کی تھی کہ اُن کے والد مولوی سراج الدین احمد خان رحلت کر گئے، اور یوں یتیمی کی دولت حمید احمد خان کے حصے میں آئی۔ قدرت جب کسی کو کچھ بنانا چاہتی ہے تو اپنی عادت کے مطابق سب سے پہلے اُسے یتیمی کی دولت سے نوازتی ہے۔ یتیم ہونا بدنصیبی کی علامت ہرگز نہیں ہے۔ جیسا کہ ہمارے معاشرے میں سمجھ لیا گیا ہے اور یتیموں کے لیے ہمارے پاس سوائے یتیم خانوں اور ترس کھانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ قدرت کا واضح اشارہ ہے کہ یتیم بچّہ جو کچھ حاصل کرے، اپنے زور بازو سے حاصل کرے اور خدا کے علاوہ اس کا حامی و مددگار کوئی نہ ہو تاریخ کا فیصلہ تو کم از کم یہی ہے کہ اس دنیا کو انھی لوگوں نے سہارا دیا ہے جن کا کبھی کوئی سہارا نہ تھا۔

اپنے والد کی دُھندلی دھندلی صورت اور یاد حمید احمد خاں کا کُل سرمایہ تھی۔ وہ شخصیت جس نے اُن پر بھرپور اثر ڈالا وہ اُن کی والدہ تھیں اپنی والدہ سے انھوں نے یہ بھی سیکھا کہ نیکی اور نیک کام بہت بڑی متاع ہے۔ دوسروں کے کام آنا اصل عبادت ہے اور شرفِ انسانیت۔ شعور پختہ ہوا تو انھوں نے بڑے بھائی مولانا ظفر علی خان کو دیکھا جن کی تحریر و تقریر کا غُلغلہ پورے برّصغیر میں تھا۔ مولانا سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ حمید احمد خان کے اُردو اسلوبِ تحریر میں کچھ نہ کچھ جھلک مولانا ظفر علی خان کے اسلوب کی دیکھی جا سکتی ہے۔

انھوں نے ایک خالص اسلامی اور مشرقی تہذیب سے رچے بسے گھرانے میں جنم لیا تھا اور اگرچہ بعد میں معاش کی وجہ سے اُن کا رہن سہن اور بول چال انگریزی معاشرت میں ڈوب گیا تھا۔ تاہم اُن کا دل ہمیشہ مشرقی رہا، اور دماغ مغربی۔ وہ مغرب کی بہت سی اچھائیوں کے شدت سے قائل تھے اور چاہتے تھے کہ جو خوبیاں اہلِ یورپ میں ہیں، وہ مسلمانوں کو ضرور اپنا لینی چاہئیں اس لیے کہ وہ انھی کے گھر سے وہاں گئی ہیں۔ مثلاً پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی، انسان دوستی، دیانت داری نظم و ضبط وغیرہ۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے قیامِ انگلستان کے بہت سے واقعات مختلف محفلوں میں سنائے اور جا بجا اپنے مضامین میں سموئے بھی۔

وہ عہدوں اور مناصب کے پیچھے بھاگنے والے آدمی نہ تھے اور نہ ان کے حصول کے لیے کوئی شر آمیز جوڑ توڑ کرتے تھے۔ بلکہ ان سے حتی الامکان کتراتے اور گھبراتے تھے۔ اُن کا اصل ذوق معلّمی کا تھا۔ تعلیم و تدریس کے صیغے میں انھیں روحانی مسرت ملتی تھی۔ وہ طالب علموں پر بڑے شفیق اور مہربان تھے۔

حمید احمد خان کا ذکر نا تمام رہے گا، اگر کچھ تھوڑا سا ذکر اُن کے اُستاد عالی مقام حضرت مولانا عبدالباری ندوی کا نہ کیا جائے۔

مولانا ندوی ادام اللہ ظلہ، کی ہستی مغتنماتِ روزگار میں سے ہے۔ جملہ فضائل و خصائلِ عالی کا مجموعہ۔ سراپا معدنِ کمال و جمال۔ شریعت و طریقت کے امتزاج کا دل آویز نمونہ۔ تقویٰ و طہارت میں یکتا، مجاہدے اور استقامت میں تنہا۔ صبر و قناعت اُن کا جوہر، ریاضت و عبادت اُن کا زیور۔ اُن کے تبحّرِ علمی اور وسعتِ نظر کی ایک عالم پر دھاک بیٹھی ہوئی، معقولات و منقولات کے اُستادِ بے بدل۔ وجاہتِ صوری سے آراستہ، ہیبتِ معنوی سے پیراستہ، اُن کے اخلاق کریمانہ، اُن کے اشفاق حکیمانہ، عجم کے حسنِ طبیعت عرب کے سوزِ دروں کی تصویر۔ اس تمام حسنِ کمال اور علمی جاہ و جلال کے باوجود اپنے آپ کو فنا کیے ہوئے

مٹائے ہوئے۔ اپنی ذات کی نفی کرنے کا فن حمید احمد خان نے مولانا ہی سے سیکھا تھا۔

مولانا شبلی کے چہیتے شاگرد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کے جاں نثار عاشق اور مُرید سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہمُ اللہ تعالیٰ کے جگری دوست مولانا عبد الماجد دریا بادی اِن کی اور یہ اُن کی خلوت وجلوت کے آشنا و راز دار، مولانا مدّتوں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن میں فلسفے اور دینیات کے اُستاد رہے۔ آج کل ضعفِ پیری کے ہاتھوں مجبور ہیں اور لکھنؤ میں قیام ہے۔ تاہم اس عمر میں بھی جب کہ طرح طرح کے عوارض نے مستقلاً گھیر رکھا ہے۔ کچھ نہ کچھ کام تصنیف وتالیف کا کیے جاتے ہیں۔ معلّم ہیں اور اپنے متقدس فرائض کا حق ادا کرنا جانتے ہیں۔ حال ہی میں آپ کی دو نئی کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ پہلی "مذہب اور سائنس" دوسری "کلامیات قرآن"۔

بہت برس ہوئے مولانا اپنے خلف الرشید شمس الباری صاحب کی تقریب شادی میں یا شاید اس کے کچھ عرصے بعد پاکستان تشریف لائے تھے اور لاہور میں چند روز قیام فرمایا تھا۔ انہی دنوں چند لمحوں کے لیے حضرت مولانا کی زیارت کا اتفاق خوش نصیبی سے راقم کو ہوا۔ اب صحیح یاد نہیں آتا کہ کہاں؟ شاید جامعۂ اشرفیہ میں یا حضرت مولانا فضل قدیر ظفر ندوی مدظلّہ العالی کے دولت کدے ظفر علی روڈ پر۔ اب تک نظارۂ جمال سے آنکھیں روشن ہیں ؏

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

حمید احمد خان کے طالع کی فیروز مندی اور بخت کی ارجمندی دیکھیے کہ انھیں استاذ الکل حضرت مولانا عبد الباری کی خدمت میں پہنچا دیا۔ مولانا نے جوہر قابل دیکھا۔ پرکھا اور عزیز شاگرد پر علم کے سوتے کھول دیے۔ محبت اور شفقت کا دریا جیسے رواں ہو گیا۔ ادھر شاگرد بھی ایسے ہی استاد کی تلاش میں تھا اس کے دل میں بھی علم کی چیٹک تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہچان لیا۔

گر نسوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

۱۹۶۳ء میں حمید احمد خان مرحوم سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور انھوں نے جس احترام ومحبت سے اپنے استاد کا ذکر کیا۔ وہ اندازِ سخن مجھے نہیں بھولتا۔ میرا خیال تھا کہ حمید احمد خان یورپ میں رہے ہیں، انگریز استادوں سے پڑھا ہے، انگریزی کے پروفیسر ہیں، بے داغ انگریزی بولتے اور لکھتے ہیں۔ پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ انھیں بھلا اسلامی تہذیب و شرافت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اپنے دور افتادہ استاد مولانا عبدالباری کہاں یاد رہے ہوں گے اور اگر یاد ہوں گے بھی تو انھیں اپنا استاد کہتے ہوئے شرمائیں گے۔ بلکہ صریحًا انکار کر دیں گے کہ جدید زمانے کے سیلِ رواں نے اِن تمام قدیم مشرقی اقدار کو خس وخاشاک بنا کر بہا دیا ہے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب حمید احمد خان نے نہ صرف بڑے فخر سے مولانا عبدالباری ندوی کی شاگردی کا اعتراف کیا، بلکہ اُنھیں یاد کر کے آب دیدہ ہو گئے۔ دیر تک یہی کیفیت رہی جیسے اُن کے ذہن میں پُرانی صحبتوں اور یادوں کے فانوس روشن ہو گئے ہوں، کہنے لگے۔

"مولانا کی شاگردی کی دولت مجھے نصیب نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں بھٹک کر کہیں کا کہیں جا نکلتا۔ میں نے بقدرِ ظرف اُن سے بہت کچھ پایا، وہ تو سمندر تھے۔ اب وہ بھارت میں ہیں، میں یہاں پاکستان میں۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے قریب ہی ہیں۔ کاش، وہ جسمانی طور پر بھی کسی صورت یہاں آ سکتے۔ پاکستان کو ایسے ساتذ؟

(باقی صفحہ ۱۶۲ پر)

اسرار زیدی

اک چراغ اور بُجھا

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

ندیم صاحب کا یہ شعر اپنے دامن میں جو تلخ حقیقتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا بھلا کون منکر ہو سکے گا۔ لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر المیہ یہ ہے کہ اعزاز کے ساتھ دفن کی توفیق بھی کتنے لوگ ہیں جنھیں میسر آتی ہے۔ ہمارے ادیب اور دانشور ناقدری ابنائے وطن کا گلہ اپنے سینوں میں دبائے ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں۔ بے شک موت تو ایک اٹل حقیقت ہے۔ ایک نہ ایک دن مرنا تو سبھی کو ہے۔ لیکن تمام تر کاوشوں جد و جہد اور قربانیوں کے عوض اگر سکون اور فرصت کے چند لمحے بھی میسر آ جائیں تو کم از کم مرنے والے کے پس ماندگاں کے دکھوں میں قدرے کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی موت اہل لاہور ہی نہیں، پورے پاکستان کے لیے الم انگیز اور لرزہ خیز ہے، اُن جیسے صاحب بصیرت لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے، ظاہر ہے اُن کی موت سے پیدا ہونے والا خلا مشکل سے ہی پُر ہو سکے گا۔

پروفیسر مرحوم کی شخصیت گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی، وہ ایک متبحر عالم، بلند پایہ محقق، صاحب طرز انشا پرداز اور ملک کے ممتاز ماہر تعلیم تھے جنھوں نے اپنی تمام عمر علم و ادب کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کی زندگی کا سب سے وسیع اور قابلِ قدر علمی و تحقیقی کارنامہ دیوانِ غالب کا نسخۂ حمیدیہ، ہے، جو انھوں نے کئی سال کی جگر کاوی کے بعد از سرِ نو مرتب کر کے شایع کرایا۔ ان دنوں کچھ عرصے سے وہ غالب پر انگریزی اور اردو میں دو کتابیں تحریر کر رہے تھے جو ان کی اچانک موت کے باعث نامکمل رہ گئیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی موت کی خبر سے لاہور کے علمی و ادبی حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ اپنی جملہ خصوصیات اور مرنجان مرنج طبع کے سبب وہ ہر حلقے میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ ان کی موت کے تیسرے روز حلقۂ ارباب ذوق کے دونوں گروپ (سیاسی و ادبی) کی طرف سے اتوار کی شام کو تعزیتی اجلاس منعقد ہوئے حلقۂ ارباب ذوق (سیاسی) میں صدارت کے فرائض ممتاز مصور ''صادقین'' نے انجام دیئے مقررین میں حسین نقی، تبسم کاشمیری مسعود اللہ خاں ایرک سپین کے نام قابلِ ذکر ہیں چاروں حضرات نے پروفیسر حمید احمد خاں کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی موت سے جو خلا، پیدا ہو گیا ہے وہ مشکل سے ہی پُر ہو سکے گا۔ پروفیسر تبسم کاشمیری نے اپنے مضمون میں مرحوم کی صلاحیت کا ذکر کیا جو اُس میں بحیثیت استاد موجود تھی۔ انھوں نے کہا کہ علم دوست کی حیثیت

سے تو اُن کو زمانہ جانتا ہے۔ لیکن اُن کی ایک مخفی خصوصیت سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنے ایک ہم جماعت طالب علم کا واقعہ پیش کیا جو بے حد غریب تھا۔ فیس تو کیا اس کو دو وقت کی صحیح خوراک بھی میسّر نہ تھی۔ اس کے ان حالات کا علم پروفیسر حمید احمد خاں کو کسی طرح ہو گیا۔ چنانچہ کلاس لینے سے قبل پہلے اُسے اپنے دفتر میں بلا کر کھانا کھلا دیتے پھر اپنے تدریسی مشاغل کی جانب توجہ دیتے۔ لطف یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا علم ایک عرصے تک کسی کو بھی نہ ہوا۔

پروفیسر انجم رومانی کی زیرِ صدارت حلقۂ اربابِ ذوق (ادبی) کے تعزیتی اجلاس میں یونس جاوید اور ڈاکٹر وزیر آغا نے مضامین پڑھے۔ پروفیسر عبادت بریلوی، انتظار حسین، اور شہرت بخاری نے گفتگو کے دوران پروفیسر مرحوم سے وابستہ یادوں کا ذکر کیا۔ یونس جاوید نے اپنے مضمون میں بتایا کہ مرحوم اُردو سے بے پناہ لگاؤ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی لفظ کا غلط تلفظ بھی گوارا نہ کرتے تھے انھوں نے کہا کہ بہت کم لوگوں نے ان کو پنجابی میں بات چیت کرتے سنا ہوگا۔ لیکن اپنے دفتر کے ایک صاحب سے وہ ہمیشہ پنجابی میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ صاحب عام طور پر مزاج کو مجاز بولا کرتے تھے۔ پروفیسر مرحوم نے ان کی تصحیح کرنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن وہ درست تلفظ نہ ادا کر سکے۔ اس پر پروفیسر مرحوم نے ہمیشہ اُن سے پنجابی زبان میں بات چیت کی۔ یُونس جاوید کا کہنا تھا مرحوم خطوں کے جواب سب سے زیادہ اہتمام سے لکھوایا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دفتر میں بھی خطوط کی فائل بالکل علیحدہ تھی۔ وعدہ نبھانے میں شاید ان کا کوئی ثانی نہ تھا اس کے علاوہ اہم معاملات میں عام طور پر پروفیسر وقار عظیم سے مشورہ کرتے تھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے مضمون میں ان یادوں کا تذکرہ تھا جو پروفیسر مرحوم سے متعلق تھیں۔ مرحوم سے ان کا تعارف ۱۹۵۹ء میں ہوا پہلی ہی ملاقات میں یہ تاثر ملا کہ وہ ادب ہی نہیں، زندگی کے ہر شعبے میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ غالب کے اس شعر کے قائل نہ تھے کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس کے برعکس انھوں نے جب کسی راہرو کا ساتھ دیا تو اسے زندگی بھر کا ساتھی سمجھا۔ لکھنے والوں کے لیے ان کا مشورہ ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ موضوع کو گرفت میں لیے بغیر اس سے انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی تحریروں اور گفتگو تک میں الفاظ کا استعمال نمود و نمائش کے لیے کبھی نہ کرتے۔ مزید برآں ان کو خود پر حاوی بھی نہ ہونے دیتے الفاظ کے ساتھ ان کا سلوک سچ پوچھیے تو استاد شاگرد کا سا تھا۔ انھوں نے ذہنی واردات کو توڑ موڑ کر پیش کرنے کی بجائے حقیقی اور سیدھے سادے انداز میں پیش کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ بھی انکشاف کیا کہ پروفیسر مرحوم اور مولانا صلاح الدین دونوں کو رومانیات سے بھی بڑا لگاؤ رہا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنی تقریر میں پروفیسر حمید احمد خاں کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے زندگی میں بے شمار لوگ دیکھے ہیں۔ لیکن پروفیسر مرحوم جیسی عظمت کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی میں بہت سے قابل اور باصلاحیت وائس چانسلر ہو گزرے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس یونیورسٹی کو حمید احمد خاں جیسا عظیم وائس چانسلر کبھی نہ ملا۔ انھوں نے سرکاری فائلوں میں بھی جو کچھ لکھا وہ فی الواقع ادب کا ایک حصہ تھا۔ جب یونیورسٹی

میں انھوں نے اپنا عہدہ سنبھالا تو اس وقت تک تمام کام انگریزی زبان میں انجام پاتا تھا اور اردو کا یہاں کوئی مقام نہ تھا لیکن محکمۂ تعلیم کے اعلیٰ افسروں کی مخالفت کے باوجود انھوں نے یونیورسٹی کا تمام کام اردو میں شروع کر دیا وہ بڑے پہلو دار فقرے لکھا کرتے ایک ایک لفظ کو بڑی احتیاط سے پرکھتے، پھر احاطۂ تحریر میں لاتے۔ پروفیسر مرحوم نے یونیورسٹی میں غالب اور اقبال پر جو کام کیا۔ وہ محققین کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔ وہ بظاہر بڑے سخت کوش لیکن انتہائی معتدل شخصیت کے مالک تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ کسی دعوت میں جاتے تو صاحب خانہ سے کہہ کر اپنے شوفر کو پہلے کھانا کھلواتے ایک بار سرکاری دورے پر ترکی گئے تو وہاں کھانے کی میز پر ان کے ہمراہ وہ شوفر بھی تھا جو حکومتِ ترکیہ کی جانب سے ان کی خدمت کے لیے مامور تھا، اس واقعہ کا ان پر بہت اثر ہوا۔ چنانچہ دوستوں کی مجلس میں اکثر کہا کرتے۔ کہ جب ترکی تہذیب میں شوفر کو اتنی اہمیت حاصل ہے تو یہاں پاکستان میں کیوں نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پروفیسر مرحوم انتہائی محنتی تھے، وہ ہمیشہ مصروف رہتے۔ طبیعت میں وفاداری کا یہ عالم تھا کہ بے پناہ مصروفیت کے باوجود ذاتی خطوط ہمیشہ اپنے ہاتھ سے لکھتے۔ ان کے خطوط بھی ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تمام زندگی ہمہ گیر اور کھلی کتاب کی مانند تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بڑے عظیم شخص تھے۔

انتظار حسین نے اپنی تقریر میں بتایا کہ خان صاحب جب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو مجھے یقین تھا کہ یونیورسٹی اب صحیح معنوں میں ایک علمی ادارہ بن جائے گی۔ چنانچہ بعد میں میرا یہ خیال بڑی حد تک درست ثابت ہوا انھوں نے دو کام تو ایسے کیے جن کی بنا پر ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ پہلا کام تو مرزا غالب کی صد سالہ برسی پر ان کی تمام تصنیفات کی اشاعت تھا۔ انتظار حسین نے انکشاف کیا کہ خان صاحب کے اس پروگرام سے افسرانِ بالا خوش نہ تھے، وہ اس مسئلے کو خوامخواہ سیاسی رنگ دے رہے تھے۔ لیکن پروفیسر مرحوم نے استقلال کا دامن تھامے رکھا اور تمام مخالفتوں کے باوجود صاحب علم افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جس کی سرکردگی میں غالب کی تمام تصانیف بڑی محنت کے ساتھ ترتیب کر کے شایع کی گئیں۔

خاں صاحب کو مسلمانوں کی تہذیب کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا وہ پاکستان اور اردو کے زبردست حامی تھے چنانچہ دوسرا اہم کام انھوں نے یہ کیا کہ پاکستانی تہذیب کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے محققین کا ایک ادارہ قایم کیا، یہ ایک ایسا علمی ادارہ تھا جس کا ہماری پوری تہذیب سے ایک رشتہ بنا۔ لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ خاں صاحب کے بعد یونیورسٹی پھر اپنی پرانی سطح پر آگئی۔

انجم رومانی نے اپنی صدارتی تقریر میں انکشاف کیا کہ پروفیسر مرحوم نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سے حساب میں بی۔اے کیا۔ ان کی حیثیت ایک چٹان کی سی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں کوئی بھی نہ خرید سکا۔ ہر شخص کے لیے اُن کے پاس محبت اور کلمۂ خیر کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کمی ایک عرصے تک محسوس ہوتی رہے گی۔

افکار کے خاص ایڈیشن / سجاد ظہیر ایڈیشن ۵/= - مصطفےٰ زیدی ایڈیشن ۸/=

زاہد فارانی

اک آزاد مرد
پروفیسر حمید احمد خاں

پروفیسر حمید احمد خاں ہم سے رخصت ہو گئے اور اپنی حسین یادوں کے قافلے چھوڑ گئے۔ وہ صحیح معنوں میں اپنی ذات میں ایک انجمن اور اپنی شخصیت میں ایک ادارہ تھے۔ اپنے ممدوح غالب کے لفظوں میں وہ ایک "محشرِ خیال" تھے وہ خانہ بند شخصیات کے اس دور میں ایک ہمہ گیر انسان تھے۔ ادیب ماہرِ تعلیم، منتظم اور محقق، پچھلی صدی سے ہمارے ہاں ہمہ گیر انسانوں کی جو روایت شروع ہوئی تھی۔ شاید خاں صاحب اس کے آخری آدمی تھے۔

ان کی شخصیت کی بڑائی، کا راز ان کی وسعتِ علم، وسعتِ مشرب اور وسعتِ قلب میں مضمر تھا، ان کی وسعتِ علم کا یہ حال تھا کہ انھیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ ورڈز ورتھ سے لے کر غالب تک کے بارے میں ان کی رائے ایک سند کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ ایک سحر کار کلاس روم ٹیچر بھی تھے۔ اور ایک گائیڈ بھی۔ یہ وہ اوصاف ہیں۔ جو کسی استاد میں شاذ و نادر ہی جمع ہوتے ہیں۔ ادب کے بڑے اساتذہ کی طرح وہ ادب میں عملی طور پر بھی شامل تھے۔ اور اس لحاظ سے شبلی، محمد حسین آزاد، تاثیر اور پطرس کی روایت کے امین تھے۔ اقبال اور غالب سے ان کی والہانہ اور عمر بھر کی وابستگی کسے معلوم نہیں۔

علم و فضل کے ساتھ ساتھ انھیں انتظامی امور میں بھی بے حد مہارت حاصل تھی۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ان تمام عہدوں پر فائز ہوئے۔ جن پر ایک استاد فائز ہو سکتا ہے۔ اسلامیہ کالج میں ان کی پرنسپلی کا زمانہ اسلامیہ کالج کا سنہری زمانہ تھا۔ ان کے زمانے میں نتھرڈ ایر سے لے کر ایم۔ اے تک کے امتحانوں میں اسلامیہ کالج کے طالب علموں کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ خاں صاحب کی وسیع القلبی اور علم دوستی کی بدولت ہر نظریے اور ہر خیال کے بہترین اساتذہ اسلامیہ کالج میں جمع تھے۔ ماحول علمی اور پاکیزہ تھا۔ اور اسلامیہ کالج کی چار دیواری اساتذہ کی "سیاست" سے نا آشنا تھی۔ پروفیسر ایرک سپرین سے ابوبکر غزنوی تک سب اساتذہ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ اور اپنے خونِ جگر سے علم و ادب کی اس روایت کی آبیاری کر رہے تھے۔ جس کا نام اسلامیہ کالج تھا اور جس کی علامت پروفیسر حمید احمد خاں تھے۔ خاں صاحب کی مثال ایک برگد کی تھی۔ جس کے سائے میں بیٹھ کر استاد اور طالب علم، دونوں علم و ادب کی معرفت حاصل کرتے تھے۔

پروفیسر حمید احمد خان کے زمانے کا ایک اور امتیازی وصف یہ بھی تھا کہ طلبہ میں علمی، ادبی اور تخلیقی سرگرمیاں اپنے عروج پر

تھیں۔ مشاعرہ شمع تاثیر اور بزم فروغ اردو کے جلسے نوجوان ادیبوں کی تربیت گاہ تھے۔ نوجوان ادیبوں کی مشہور تنظیم ینگ رائٹرز بھی خان صاحب کے زمانے ہی میں قایم ہوئی۔ اسی زمانے میں منیر نیازی نے "نصرت" میں کالم لکھتے ہوئے کہا تھا کہ اردو ادب گورنمنٹ کالج سے نکل کر اور کچہری کا گول چکر پار کر کے اسلامیہ کالج میں داخل ہو گیا ہے۔ خاں صاحب کی پرنسپلی کے زمانے کے طالب علم آج علم و ادب، صحافت، تعلیم و تدریس اور زندگی کے دوسرے اہم شعبوں میں نام پیدا کر چکے ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خان کی وسیع القلبی کا یہ حال تھا کہ وہ ان تمام لوگوں کو گلے لگا لیتے اور ان کی قدر کرتے، جو بے شک ان کے ہم خیال تو نہ تھے، لیکن اپنی قابلیت اور اہلیت کی بنا پر قابلِ عزت اور قابلِ قدر تھے۔ خاں صاحب مرحوم اپنے سیاسی نظریے کے لحاظ سے کٹر قسم کے پرانے مسلم لیگی تھے۔ لیکن جب اسلامیہ کالج دو حصوں میں منقسم ہوا، اور وہ سول لائنز کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تو انھوں نے اپنے کالج کے لیے پروفیسر ایرک سپرین کا انتخاب کیا۔ اسی طرح پروفیسر امین مغل کا تقرر بھی خان صاحب ہی کے زمانے میں ہوا۔ اس سلسلے میں ایک اور قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ جب فیض احمد فیض آخری مرتبہ گرفتار ہوئے، تو ادیبوں کے جس وفد نے فیض صاحب کی رہائی کے لیے جدوجہد کی، اور اربابِ اقتدار سے رابطہ قایم کیا۔ اس وفد کے سربراہ بھی پروفیسر حمید احمد خان ہی تھے۔ یہ بھی خان صاحب کا حصہ تھا کہ انھوں نے اسلامیہ کالج کی تقریبات میں جہاں حفیظ جالندھری کو بلایا، وہاں فیض احمد فیض اور دیوندر ستیارتھی کو بھی مدعو کیا۔ مرحوم میں تعصب نام کو نہیں تھا۔ وہ غالب کے لفظوں میں ایک "آزاد مرد" تھے۔ ان کا عقیدہ انسان دوستی اور ان کا نظریہ انسانی عظمت کا احترام تھا۔

پروفیسر صاحب ایک بہت بڑے قوم پرست تھے۔ ان کی پسند اور ناپسند کا تعین صرف اپنے ملک، اپنی قوم اور تہذیب کی محبت کے حوالے سے ہوتا تھا۔ اردو زبان سے ان کی محبت کا سبب بھی یہی تھا۔ وہ اردو کو پاکستانی قومیت کی علامت سمجھتے تھے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ مرحوم انگریزی زبان کے بہت بڑے فاضل اور جلیل القدر استاد تھے۔ وہ انگریزی ادبیات میں کیمبرج یونیورسٹی کے فاضل تھے۔ اور سالہا سال تک ایم۔ اے انگریزی کی کلاسوں کو پڑھاتے رہے۔ لیکن انھوں نے تن من اور دھن سے اردو زبان کی خدمت کی۔ وہ اردو کے جاں نثار سپاہی تھے۔ جب تک جیے اردو کی عظمت کی بحالی کے لیے لڑتے رہے۔ انھوں نے اسلامیہ کالج کی بزم فروغ اردو سے لے کر بابائے اردو کی اردو کانفرنس تک ہر جگہ اردو زبان و ادب کی ترقی فروغ اور سربلندی کے لیے عملی جدوجہد کی۔ مجھے یاد ہے جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو ایک مرتبہ ترکی کے کچھ پروفیسر حضرات یونیورسٹی آئے۔ ان کے استقبال کے لیے ایک تقریب منعقد ہوئی، جس کی صدارت خاں صاحب نے فرمائی۔ جب خاں صاحب کی باری آئی تو انھوں نے کہا، مجھے افسوس ہے کہ ترکی زبان نہ جاننے کی وجہ سے میں اپنے مہمانوں کے سامنے ایسی زبان میں تقریر کرنے پر مجبور ہوں، جسے ہماری قوم کب کا رد کر چکی ہے۔ اسی طرح بی۔ اے اور بی۔ ایس۔ سی اور ایم۔ اے کے امتحانات میں اردو کا ذریعہ اظہار بنایا جانا اور یونیورسٹی کی ڈگری کا اردو میں طبع ہونا پروفیسر صاحب کی اردو پرستی کی جیتی جاگتی یادگاریں ہیں۔ ان کی اردو پرستی یہیں تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اردو ادب کے ایک مجتہد نقاد اور محقق بھی تھے۔ غالب کے بارے میں ان کی تحقیق اور اقبال کے بارے میں ان کے مضامین، پھر اردو غزل کے بارے میں ان کا مضمون پوری دنیائے اردو میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ خاں صاحب ایسے ادیب تھے، جن کا بلند ادبی مرتبہ ان کی تحریروں کی مقدار سے نہیں بلکہ معیار سے متعین ہوتا ہے۔ ان کے اندر ایک بہت بڑا ادیب چھپا ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنی ملازمت کی مصروفیات

کی وجہ سے اپنی بے پناہ ادبی صلاحیت سے پوری طرح انصاف نہ کر سکے۔ وہ اپنے دوستوں سے اکثر کہا کرتے تھے۔ "میری ملازمت میری موت" ہے۔ پروفیسر صاحب غالب کے شیدائی تھے۔ ان کی غالب پرستی کا سلسلہ بلی ماران سے لے کر مجلس ترقی ادب تک پھیلا ہوا تھا۔ غالب کی صد سالہ برسی منانے کی تحریک اور اس تحریک کو سرکاری سطح پر تسلیم کرانا اس سلسلے میں ان کا تازہ ترین اور آخری کارنامہ تھا۔ وہ اقبالیات کے بھی بلند پایہ عالم تھے۔ اقبال کی شاعری پر انگریزی شاعروں کے اثرات کے بارے میں ان کا مقالہ اس موضوع پر سب سے پہلا اور اہم ترین مقالہ تھا۔ اور یہ مقالہ انھوں نے سب سے پہلے حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاس میں پڑھا تھا۔ حلقہ سے ان کی وابستگی بہت پرانی تھی۔ سالہا سال تک وہ حلقے کے ہفت روزہ جلسوں میں باقاعدگی سے شریک رہے اور اہل حلقہ کو اپنے مضامین سے فیض یاب کرتے رہے۔ اگرچہ بعد میں ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری نہ رہ سکا۔ لیکن حلقے کے سالانہ جلسوں میں وہ کم و بیش باقاعدگی سے آتے رہے اور انھوں نے کئی ایک جلسوں کی صدارت بھی فرمائی۔

خدا نے پروفیسر حمید احمد خان کو جہاں ایک ذہن رسا عطا کیا تھا، وہاں انھیں ایک حساس اور درد مند دل بھی دیا تھا۔ ان کی ہمدردیاں اور مہربانیاں لامحدود تھیں۔ وہ اپنے شاگردوں اور طالب علموں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز جانتے تھے اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے تھے۔ وہ اپنے طالب علموں کی صلاحیتوں کی قدر کرتے تھے۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں ۱۹۵۹-۶۱ء میں اسلامیہ کالج کا طالب علم تھا۔ اور خان صاحب اس کے پرنسپل تھے۔ بزم فروغ اردو کے سیکرٹری کی حیثیت سے مجھے خان صاحب سے قریب ہونے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں محمود نظامی کا انتقال ہوا تو کالج میگزین "فاران" کا ایک شمارہ ان کی یاد کے لیے وقف کیا گیا۔ اس شمارے میں سب سے زیادہ مضامین میرے تھے۔ یہ شمارہ بہت کامیاب ہوا اور تقریباً تمام مشہور اخبارات اور رسائل نے اپنے تبصروں میں اس شمارے کی بہت تعریف کی۔ خاں صاحب میری کارکردگی سے بہت خوش ہوئے، اور مجھے بہت شاباش دی۔ اس کے بعد میں ان سے قریب تر ہوتا گیا۔ مجھے اس زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے۔ دوسرے کالجوں کی طرح اسلامیہ کالج میں بھی کھلاڑیوں کو فیس معافی کی رعایت دینے کا دستور تھا۔ مجھے بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی کہ خان صاحب کے پاس حاضر ہوا، اور ان سے درخواست کی کہ اس رعایت کو صرف کھلاڑیوں تک محدود نہ رکھا جائے۔ بلکہ ادیب طالب علموں کو بھی یہ رعایت دی جائے۔ سینیئر طالب علموں نے میری اس تجویز کا مذاق اڑایا اور کہا کہ یہ تجویز پیش نہ کرنا کیونکہ جو تبدیلی تم چاہتے ہو وہ کسی کالج میں بھی رائج نہیں ہے۔ میں نے اپنی رائے تبدیل نہ کی اور اس مضمون کی ایک درخواست لے کر پرنسپل صاحب کے پاس حاضر ہو گیا۔ میرے دوستوں کی توقعات کے خلاف یہ درخواست منظور ہو گئی اور خاں صاحب کی ادب دوستی نے ایک نئی روایت قایم کر دی۔ خاں صاحب کے ساتھ میری نیازمندی کا سلسلہ زمانہ طالب علمی سے لے کر ان کی وفات تک قایم رہا۔ بلکہ پھلتا پھولتا گیا۔ لیکن اس "درد کے رشتے" کی نشو و نما میں صرف خان صاحب کی شفقت، محبت، مہربانی اور سرپرستی کو دخل تھا اور بس۔ میں بی۔ اے کرنے کے بعد اپنے نامساعد حالات کی وجہ سے سلسلہ تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور اے۔ جی آفس میں ملازم ہو گیا۔ میں ابھی اے۔ جی آفس ہی میں تھا کہ خاں صاحب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے۔ میں نے بڑے تامل کے ساتھ انھیں مبارک باد کا خط لکھا۔ کیونکہ اپنی معمولی معاشرتی حیثیت اور ان کے اونچے عہدے کی وجہ سے مجھے یہ خدشہ تھا کہ شاید خان صاحب اس خط کا جواب بھی نہ دیں گے۔ میرے اس خدشے کو شکست

ہوئی۔ اور خاں صاحب نے اسی پیار اور انس کے ساتھ مجھے شکریے کا خط لکھا جس کے وہ پیکر تھے۔ یہ بھی ان کی وائس چانسلری کے زمانے کا ذکر ہے کہ میں نے درجہ دوم کی ایک ملازمت کی درخواست دی (ملازمت کا یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا) حسبِ معمول خان صاحب کے پاس حاضر ہوا۔ خان صاحب آج کل کے اکثر بزرگوں کی طرح ٹال مٹول اور بخل کے عادی نہ تھے۔ ان کی دوستی اٹل تھی۔ ان کا دل دریا تھا۔ اور ان کا خلوص برحق۔ وہ ہر قیمت پر اپنے دوستوں اور شاگردوں کی مدد کرنا جانتے تھے۔ توقع کے مطابق میرا کام ہوگیا۔ میں شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ انھوں نے ایسی بے نیازی کا اظہار کیا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

کہنے لگے۔ "بھائی، انسان اپنی زندگی میں کئی تیر پھینکتا ہے۔ کبھی کوئی نشانے پر بھی لگ جاتا ہے۔"

خان صاحب نے اپنی وائس چانسلری پر کبھی فخر نہیں کیا۔ البتہ انھیں اپنے استاد اور ادیب ہونے پر ناز تھا۔ وہ استادوں اور ادیبوں میں اس انس اور اپنائیت کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ جیسے اپنے اہلِ خانہ کے درمیان بیٹھے ہوں۔ وہ ان صاحب اقتدار لوگوں کے بالکل برعکس تھے۔ جو ادبی محفلوں میں بیٹھ کر تو ادیبوں کے فن پاروں کی داد دیتے ہیں۔ لیکن جب کبھی زندگی میں کسی ادیب کو ان کی مدد کی ضرورت ہو تو آنکھیں چرا لیتے ہیں۔ خان صاحب ہر ادیب کا احترام کرتے تھے۔ خواہ وہ کوئی سینیئر ادیب ہو یا نو عمر، ان کا ملنے والا ہو یا اجنبی۔ وہ اپنے شاگردوں اور دوستوں کی عزت ان کے معاشرتی مرتبے کے حوالے سے نہیں بلکہ ان کی علمی اور ادبی خدمات کی بنا پر کرتے تھے۔ جس زمانے میں میں حلقۂ ارباب ذوق کا جائنٹ سیکریٹری تھا تو مرحوم جب کبھی حلقے کے جلسے میں تشریف لاتے مجھے وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں بھی وہ حلقے کے سالانہ جلسے میں آتے اور جلسے کے بعد پاک ٹی ہاؤس کی محفل میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ شریک ہوتے۔ مجھ پر ان کی شفقت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ جس محفل میں ملتے۔ مجھے اپنا دوست کہہ کر متعارف کراتے۔ مجھے فخر ہے کہ اُن کا آخری ادبی انٹرویو میں نے لیا اور وہ ماہِ نو میں شایع ہوا۔

چند ماہ پہلے میں خاں صاحب سے ملنے مجلس ترقی ادب کے دفتر گیا، تو انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ادبی تحریروں کو یک جا کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں ماہِ نو کے اس پرچے کی ضرورت ہے۔ اگلے روز میں نے وہ پرچہ پیش کر دیا۔ اس سے اگلے روز میں شام کو مزنگ روڈ پر اپنے دفتر کے برآمدے میں داخل ہو رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پروفیسر حمید احمد خان اپنے چھوٹے صاحبزادے کے ساتھ جا رہے ہیں۔ ان کی پشت میری طرف تھی۔ میں بھاگ کر ان کے پاس پہنچا۔ پوچھا کہ کدھر سے تشریف لا رہے ہیں۔ فرمانے لگے تمھاری طرف ہی آیا تھا۔ لیکن تمھارا دفتر نہیں ملا۔ میں نے معذرت کی اور آمد کا مقصد پوچھا۔ فرمانے لگے کل تم میری میز پر ایک کاغذ بھول آئے تھے۔ جو کوئی دفتری کاغذ معلوم ہوتا ہے، میں نے سوچا، خدا جانے تمھیں اس کی کتنی ضرورت ہو۔ اس لیے تمھیں پہنچانے کے لیے چلا آیا۔ ان کی یہ بات سُن کر میری آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں مجھ سے اور اپنے دوسرے بے شمار عقیدت مندوں سے جدا ہو چکے ہیں، ان کی جدائی نے دلوں کے جو گوشے ویران کر دیے ہیں انھیں کوئی دوسرا آباد نہیں کر سکتا۔

تھی جو اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

یونس جاوید

دوسرا دن

یہ ۲۳ر مارچ ۱۹۷۶ء کا دن ہے گرد آلود ہواؤں نے اوک بھر مٹی ہر سر میں ڈال دی ہے اور بہاول پور روڈ کی عید گاہ میں سروں کا سمندر ہے۔

ابھی ابھی یہاں ایک جنازہ پڑھا جا چکا ہے، میت، قبر میں ہمیشہ کے لیے اوجھل ہونے کے لیے روانہ ہو گئی ہے۔ عیدگاہ کے آس پاس لوگ ٹکڑیوں میں بٹے ٹیڑھے میڑھے دائروں میں کھڑے ہیں۔ دنیا بھر کے موضوعات زیر بحث ہیں۔ ہانپتے سانسوں سے موضوعات پر سے جلد جلد پھسلتے ہوئے ان میں کچھ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا:

"اب مجلس میں کون آ رہا ہے؟" — اس شخص کی میت ابھی دفن نہیں ہوئی، جس نے دوستوں کے جنازوں کو کندھے بھی دیئے تھے، دفن بھی کیا تھا اور پھر ورثا کے غم میں ہمیشہ کے لیے شریک ہو گیا تھا۔

ایک نے پوچھا: "اب مجلس ترقی ادب، میں کون ڈائرکٹر ہو گا؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں۔"

"......... صاحب تو نہیں آ رہے؟"

"شاید!"

"خدا کے لیے کچھ کرو — اسے روکو — وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"پہلے سرگوشی ہوتی ہے — پھر قہقہہ لگایا جاتا ہے اور ایک کہتا ہے —

"آپ قبرستان تک، میت کے ساتھ نہیں جائیں گے؟" —

"نہیں — دوسرا شخص کہتا ہے — سب لوگ مجھے یہیں مل گئے تھے۔" —

لمحہ بھر توقف کے بعد تیسرا پوچھتا ہے —

"حنیف رامے صاحب آئے تھے؟" —

"جی ہاں — صبح گھر آئے تھے" —

ایک شخص چاروں طرف گھومتا ہوا کہتا ہے "ابھی ابھی کاردار صاحب کو میں نے جنازے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔" دوسرا کہتا ہے — ڈاکٹر عبدالخالق بھی یہیں تھے — ارے — انھوں نے ایک طرف گھورتے ہوئے جیسے اپنے

آپ سے پوچھا — یہ اجمل صاحب تو نہیں ہے۔ یہ کب آئے ہیں — اور پھر ڈاکٹر اجمل صاحب کے پیچھے لپک گئے —

یہ سب لوگ مرنے والے کے دوست تھے۔ اور بظاہر سنگ دل نہ تھے، اور ابھی ابھی جس شخص کا جنازہ پڑھ کر میت کو قبر کی طرف لے جایا گیا تھا وہ حمید احمد خاں تھے۔ معاف کیجیے۔ پروفیسر حمید احمد خاں۔ جن کی زندگی میں مجھے کبھی یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ میں ان کا نام پروفیسر کے لفظ کے بغیر لکھوں — یا بولوں — مگر اب میرے علاوہ دوسرے لوگ بھی تو ان کے نام کے اس حصے کو حذف کر رہے تھے —

مجھے یاد ہے — پہلی مرتبہ جب میں نے انھیں اس لفظ کے بغیر لکھا تھا۔ تو انھوں نے کہا تھا — "بھائی — جو چار دن میں نے پڑھانے میں صرف کیے ہیں۔ اس کا نشان تو رہنے دو!" —

جب ان کا تقرر مجلس ترقی ادب میں ہوا، وہ ملک سے باہر تھے اور یہ تقرر ان کی عدم موجودگی ہی میں عمل میں آیا تھا۔ واپس آئے۔ پہلے روز اسٹاف میٹنگ بلائی۔ تاج صاحب والی کرسی اٹھوائی، دوسری رکھوائی۔ بیٹھنے سے پہلے کہا: —

"جسارت ہے کہ جس جگہ کل تک میرا دوست بیٹھا کرتا تھا۔ میں بیٹھ جاؤں۔ مگر زندگی انہی رنگوں سے عبارت ہے۔"

پھر کہا۔ دو باتیں میں آپ کے گوش گذار کرنا ضروری سمجھتا ہوں —

ایک تو یہ کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد میں نے جھوٹ نہیں بولا، جس کا مطلب ہے کہ جھوٹ مجھے پسند نہیں۔ دوسری یہ کہ بعض اوقات میرے لہجے کے باعث دوستوں اور رفیقوں کو مجھ سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ میرے قلم سے آپ کے خلاف کچھ نہ لکھا جائے گا۔ ایک بات اور بھی آپ کو بتا ہی دوں کہ جن لوگوں نے مجھ سے کبھی نہ کبھی کچھ پڑھ رکھا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ عزیز بھی ہیں۔ لیکن اگر آپ کو ان سے جائز شکایت ہوئی، تو انصاف بہر حال ہوگا۔ شاگردوں سے انھیں کس قدر پیار تھا۔ ان کے مسائل ذاتی ہوں یا گھریلو۔ خاں صاحب انھیں اتنا اہم بنا لیتے۔ جس قدر ان کے لیے غالب اور اقبال کا مضمون تھا، یا پھر کسی بھی شخص کا خط — خط کا جواب تو وہ بڑے ہی اہتمام سے دیا کرتے۔ ایک دفعہ لکھتے۔ ٹائپ ہوتا۔ غلطیاں لگتیں۔ پھر ٹائپ ہوتا۔ رجانے والے کے خط کو ہاتھ سے لکھتے تھے) کاغذ کو بڑی احتیاط سے تہہ کرتے ہوئے لفافہ خود بند کرتے۔ پتے کو چیک کرتے۔ اپنی مہر لگواتے تب ڈاک رجسٹر پر چڑھتی۔ ڈاک میں جانے والے خط کی شہادت اس شخص سے لیتے جو خط پوسٹ کرنے گیا ہو۔ خط دستی بھجوایا گیا ہو تو رسید دیکھتے۔ اور پھر ان کے چہرے پر روشنی آ جاتی — وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے اور خوش گوار گفتگو کرنے لگتے — اور میں اکثر سوچتا، یہ ایک خط کا بوجھ تھا' یا — ایک پہاڑ کا۔

دوستوں، عزیزوں، شاگردوں، رفیقوں اور دفتر سے متعلق خطوط کی سینکڑوں فائلیں ایک الماری میں بند ہیں۔ وہاں ہر شخص کی فائل حروفِ ابجد کے لحاظ سے رکھی ہے۔ خطوط اور ان کے جوابات کی نقول محفوظ ہیں۔

آپ نے انھیں پنجابی بولتے ہوئے شاید نہ دیکھا ہو — مگر میں نے انھیں پنجابی بولتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور روتے ہوئے بھی۔

دفتر میں ایک صاحب ایسے تھے جو اردو کا تلفظ حد درجہ غلط بولتے تھے ۔ خاں صاحب نے اس شخص سے کہا ۔ "تسی میرے نال پنجابی وچ گل کرلیا کرو ۔" جب وہ چلا گیا تو مجھ سے کہا ۔ اردو کے ساتھ یہ سلوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ مجھ سے مزاج کے بجائے مجاز بولے ۔ میں نے کوشش تو کی تھی کہ یہ صحت مند اردو سیکھ لیں ، مگر اب کیا کریں ان کی مجبوری ہے ۔

ڈھاکہ فال ہونے کے دوسرے روز وہ بہت سویرے دفتر آ گئے ۔ چہرے پر سوالات کی زردی تھی ۔ ہمیں کمرے میں بلایا ۔ اور کہا اب جینے کی خواہش باقی نہیں رہی ۔ پھر باتوں باتوں میں آزادی کی تحریکوں سے پاکستان کے وجود اور اس کے بعد جو بھی خواب انھوں نے دیکھے تھے ہمیں دکھائے ۔ تاریخ ، لفظوں کے فریم میں تصویر بن کر آ سجی تھی ۔

اس روز ہندوستانی جہازوں کی پروازیں لاہور پر بڑی نیچی اور پے درپے تھیں ، پے در پے اتنی کہ سارا ن جہاز گذر جانے کے بعد گونجتا ، اور نیچی اس قدر کہ بعض اوقات گمان ہوتا کہ وہ ہمارے دفتر سے ملحقہ ہوٹل انٹر کانٹیننٹل کی چھت سے ٹکرا جائیں گے ۔ اتنے میں کسی نے اطلاع دی کہ ہندوستانی جہازوں نے گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر رکھی ہے جو دفتر کے آس پاس نشانات چھوڑ گئی ہے ۔

خاں صاحب اٹھے ۔ اور مجلس کے وسیع لان میں ٹہلنے لگے ۔ دو تین مرتبہ جہاز ناقابلِ برداشت گڑگڑاہٹ پیدا کرتے ہوئے گزرے ۔ میں نے ان سے ڈرتے ہوئے درخواست کی کہ وہ اندر آ جائیں ۔ تو وہ رو پڑے ۔ کہنے لگے ۔ "میری خواہش ہے کہ گولیوں کی بوچھاڑ میرے اوپر سے گذرے ۔ یا بم میرے پاؤں میں آکر گرے کہ میں فنا ہو جاؤں ۔"

یہ سب کچھ کس کی کوتاہی سے ہوا ۔ اور کون ذمہ دار نہیں ہے ۔ یہ وقت بحث کا نہیں ہے ۔ یہ تو مرنے کا وقت ہے ۔ ایک لمحہ توقف کے بعد بولے ۔ مگر یہ آپ لوگوں کے مرنے کا وقت نہیں ہے ۔ آپ اندر جائیں ۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ لفظ ایک طاقت ہے اور اس کی کئی سطحیں اور پرتیں ہوتی ہیں ۔ اگر آپ نے اسے ایک ہی معنی میں استعمال کر دیا تو پھر آپ اس طاقت کو استعمال کرنے کا ہنر بالکل نہیں جانتے ۔ لفظ کا صحیح استعمال صحیح املا کے ساتھ اور تلفظ کا صحیح استعمال صحیح لہجے کے ساتھ ان کا ایمان تھا ۔ اس سلسلے میں انھیں ماضی سے سند لینا پڑتی تو ضرور لیتے ۔

میں نے "نسبتاً" کا لفظ (یعنی " ہ " کے بجائے " ا " سے) لکھا تو کہا اگر حالی اور شبلی نے الف سے لکھا ہے تو درست ہے ، ورنہ سیکھ لیجیے کہ نسبتہً ہ سے ہوتا ہے ۔

دوسری مرتبہ میں نے "برصغیر" کہا تو مجھے سمجھایا کہ برّاعظم کے بعد برعظیم ہونا چاہیے ۔ برصغیر تو مٹی کا ڈھیلا بھی ہو سکتا ہے ۔ (ان کا ایک مضمون "لفظوں کا استعمال" ان کے زیرِ طبع مجموعے "تہذیب و تعلیم" میں چھپ رہا ہے)

اگر میں یہ کہوں کہ غالب اور اقبال سے انھیں عشق تھا تو غلط نہ ہوگا ۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے غالب و اقبال پر (اور اس کے علاوہ بھی) جو کچھ لکھا ، بہت کم لکھا ، مگر مستند لکھا ۔ اور اس کی

وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کے ہر لفظ کے پیچھے گھنٹوں کی فکر ہوتی تھی اور چند لائنوں کے پس منظر میں تو ان کی راتوں کی نیند اور دلوں کا چین گھلا ہوتا تھا۔

چند روز پیشتر ایک صاحب اقبال کا ایک شعر انگریزی میں ترجمہ کرانے کے لیے پہنچے۔ انھوں نے بتایا کہ قرطبہ کے ٹاؤن ہال میں علامہ اقبال کی ایک تصویر آویزاں کی جا رہی ہے اس تصویر کے نیچے یہ انگریزی ترجمہ اور اس انگریزی ترجمے سے کیا ہوا، فرانسیسی ترجمہ لکھنا ہوگا۔

اقبال، قرطبہ — دونوں چیزیں کچھ اس طرح یک جا ہوئیں کہ اپنی ہر سانس کو قیمتی اور آخری سمجھتے ہوئے بھی انھوں نے تمام مصروفیات معطل کر دیں۔ اور ایک ایک لفظ کے مختلف رنگوں کا سراغ لگانے بیٹھ گئے۔ باوجود اس کے کہ ان کا ہر لفظ سند تھا۔ انھوں نے کئی دفعہ اس شعر کو انگریزی میں ڈھالا۔ دو دن میں یہ کام مکمل ہوا تو بے پناہ خوش تھے کہا یہ کام میرے لیے چنداں مشکل تو نہ تھا۔ مگر میں چاہتا تھا کہ انگریزی ترجمہ اس قدر درست ہو کہ اسے فرانسیسی میں ترجمہ کرتے ہوئے دوسرے مترجم اس شعر کے معنی گم نہ کر دیں۔

اقبال کے عشق نے ہی انھیں مجبور کیا تو اقبال صدی کے اہتمام میں انھوں نے خصوصًا اقبال پر چار نئی کتابیں شایع کروائیں۔ اور جلسہ بھی کیا۔

جلسے کے بعد وہ حد درجہ مطمئن تھے۔ کہنے لگے۔ کل "سب لوگ" ایک جگہ جمع ہو کر چائے پئیں — میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کرسیاں بچھیں۔ چپراسی بھی تھے۔ مالی بھی۔ مگر خاکروب نہیں تھا۔ پوچھا جلال کہاں ہے۔ بلاؤ۔ "سب لوگوں" سے میری مراد سب لوگ ہی ہیں۔ پھر اس کے لیے کرسی منگوا کر رکھوائی اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔ تو بولے۔ "تم عیسائی ہونے کی وجہ سے ہمارے ساتھ چائے پینا پسند نہ کرو تو الگ بات ہے۔ مگر ہمیں تمھارے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے میں کوئی عار نہیں اور پھر اس جلسے کا اہتمام کرنے والوں میں تمھارا حصہ بھی اتنا ہی ہے جتنا باقی دوسروں کا۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ میں اور میرا دفتر اکثر انہی کے حوالے سے پہچانے گئے کوئی مجھ سے پوچھتا۔ کہاں کام کرتے ہو۔ میں کہتا مجلس میں! وہ سوالیہ لہجے میں کہتا، مجلس؟ — میں انگریزی میں وضاحت کرتا
BOARD FOR ADVANCEMENT OF LITERATURE —

انگریزی نام سن کر اکثر لوگ یہ جانے بغیر کہ میں کہاں کام کرتا ہوں۔ چپ ہو جاتے۔ اور جب میں انھیں بتاتا کہ میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے دفتر میں کام کرتا ہوں، تو وہ کہتے — "اچھا تو یوں کہو نا—" اور خاں صاحب کا حال یہ تھا کہ کبھی کوئی تحریر لکھتے تو کلب علی خاں فائق صاحب اور مجھے بلا کر سناتے اور کہتے دیکھیے یہ جملہ یوں درست رہے گا یا دوں۔ فائق صاحب کبھی کوئی مشورہ دیتے تو وہ جملہ بدل دیتے۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ تمام عمر ان کی حیثیت طالب علمانہ رہی۔ سیکھنے اور جاننے کے لیے ایک اضطراب انھیں ہر وقت بے چین رکھتا تھا باوجود اس کے کہ وہ بہت جانتے تھے اور وہ سب کچھ بھی جانتے تھے جس کے سامنے ہماری معلومات کی حیثیت (خصوصًا میری) ذرّے کے برابر ہے۔

ان کا غصہ محض زبان اور چند لمحوں کے لیے ہوتا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس شخص کو بلاتے جس سے ابھی ابھی وہ ناراض ہو گئے تھے اور کہتے "تشریف رکھیے"۔ اور پھر نہایت محبت اور شفقت سے بالکل اس طرح سمجھاتے جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کو سمجھاتا ہے، اس میں ان کا حکم نہ ہوتا، مشورہ تجویز اور نصیحت ہوتی۔

دوسروں کے ذاتی کاموں میں مداخلت کبھی نہ کرتے، مگر کبھی کبھی نصیحت ضرور کرتے۔ ایک مرتبہ، جب میں ایم۔اے کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا انھوں نے مجھ سے کہا۔ "یونس جاوید صاحب (اکثر انہی الفاظ سے مخاطب کرتے تھے) اورنیٹل کالج کے کسی استاد کو ناراض نہ کیجیے گا۔" پھر ایک لمحہ رک کر کہا۔ "سیاستِ علم و ادب سے بہت سطحی چیز ہے۔ اور یہ سطحی چیز اورنیٹل کالج میں جا کر کچھ اور بھی سطحی ہو گئی ہے۔ میں تو وائس چانسلر بھی رہا ہوں اور وہاں کے ماحول کو جانتا ہوں۔ مگر آپ کو زیادہ فکر کی بھی ضرورت نہیں۔ آدمی اپنی سفارش خود ہوتا ہے۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انھوں نے جو بھی وعدہ ایک مرتبہ کر لیا پھر اسے ہر طرح نبھایا۔ یہ وعدہ اپنے آپ سے ہوتا یا کسی دوسرے سے، پھر اس سے پھرنا کم از کم ان کے لیے محال تھا۔ حتیٰ کہ کسی کو ملاقات کا وقت ۹ بجے دیا ہوتا تو ۸ بج کر پچپن منٹ پر اس کا انتظار شروع کر دیتے۔ دفتر کو ہدایات مل جاتیں، ملاقاتی کا کام اگر دفتر سے متعلق ہوتا تو اس کی آمد سے پہلے پہلے ہر فائل تیار رہتا۔

ملاقاتی اگر صحیح وقت پر آ جاتا تو وہ بہت خوش ہوتے، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی طبیعت خراب ہونے لگتی۔ موڈ بگڑ جاتا اور بے چینی اس حد تک بڑھ جاتی کہ ہر کوئی اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھا بھی ڈر رہا ہوتا تھا۔ میں نے چار پانچ برس کی مدت میں انھیں کسی کو وقت دے کر بھولتے ہوئے نہیں دیکھا۔

مگر ۲۲ر مارچ ۱۹۷۸ء کو انھوں نے بہت سی وعدہ خلافیاں ایک ساتھ کر دیں۔ بہت سوں کو وقت دیا مگر بھول گئے۔

۲۴ر مارچ کو انھیں عبداللہ قریشی سے ملنا تھا۔ ساڑھے نو بجے کا وقت طے ہو گیا تھا اور وہ دس بجے تک نہ آئے تھے۔ پچھلے ۵ برسوں میں میرے سامنے ان کی یہ پہلی طے شدہ ملاقات تھی جسے وہ نبھا نہ سکے تھے ——— (یہ پہلی وعدہ خلافی تھی)۔

انتظار حسین نے "انشا کی دو کہانیاں" مرتب کیں اور دیباچہ لکھا۔ خاں صاحب دیباچہ پڑھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ ایک جلسے کے دوران میں سب دوستوں کو جا جا کر دکھلایا اور ان سے کہا "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اسے ضرور پڑھیے"۔ اس حوالے سے مشرق پڑھنا شروع کر دیا۔ ہر روز خبروں کے لیے "پاکستان ٹائمز" اور "لاہور نامہ" کے لیے مشرق دیکھتے۔ اور کبھی کبھی مجھے بھی تلقین کرتے۔ ایک مرتبہ تو یہ بھی کہا کہ "ہمیں یہ بات مان لینی چاہیے کہ ہمارے درمیان ایک شخص ایسا بھی ہے جو عجیب و غریب لکھتا ہے۔"

مگر ۲۲ر مارچ کو انھوں نے مشرق منگوایا۔ اور کہا دفتر جانے سے پہلے میں لاہور نامہ پڑھوں گا ——— مگر پڑھنے کے بجائے اخبار منہ پر رکھ لیا اور لیٹ گئے، کالم نہ پڑھ سکے۔ یہ دوسری وعدہ خلافی تھی۔ ہر روز صبح نو بجے وہ وقار عظیم صاحب کو فون کرتے تھے۔ بعض باتوں کا فیصلہ کر لینے کے باوجود بھی ان سے مشورہ کرتے۔ تفصیل بتاتے اور

پوری جزئیات کے ساتھ مسئلے پر بات چیت ہوتی۔ حتیٰ کہ ہم میں سے کسی شخص سے انھیں کام کے سلسلے میں کوئی گلہ ہوتا تو ہمیں سامنے بٹھا لیتے اور وقار صاحب کو سب کچھ بتا دیتے۔ پھر ان کے بارے میں، ان کی صحت کے بارے میں، اپنی صحت کے بارے میں، ان کے کام اور اپنے کاموں کے بارے میں باتیں ہوتیں۔ فون بند کرتے تو مجھ سے کہتے۔ وقار صاحب سے بات کر کے میرا کتنا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ وقار صاحب نہ ہوئے، وٹامنز ہو گئے کہ اُن کا فون بھی میرے لیے تقویت کا باعث ہے۔

اگر معمول کے مطابق انھوں نے وقار صاحب کو ۲۲ر مارچ کو فون نہیں کیا تو یہ ان کی تیسری وعدہ خلافی تھی۔ جی چاہتا ہے خاں صاحب سے سوال کروں کہ آپ نے تو کبھی وعدہ خلافی نہ کی تھی۔ ۲۲ر مارچ کا دن کیا قیامت کا دن ہے کہ آپ اتنی ساری وعدہ خلافیوں کے مرتکب ہوئے؟ —

پچھلے دو چار ماہ سے ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ کام بہت زیادہ ہے اور سانس بہت کم ہیں۔ خدا کرے مرنے سے پہلے غالب والی کتاب مکمل ہو جائے۔ اسی دوران میں انھوں نے اقبال کے فلسفے پر ایک مقالہ تحریر کرنا شروع کر دیا۔ اس بات سے اضطراب اور بڑھ گیا کہ زندگی تو جتنی بھی تھی، اتنی ہی ہو گی، مگر کام بڑھ گیا ہے۔

ان کی شخصیت میں ہزاروں موڑ تھے، مگر جس راستے کی طرف وہ جا رہے تھے اس کا ایک ہی موڑ تھا، اور یہ موڑ ان سے لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اور اب تو وہ اس قریب آتے ہوئے موڑ کو دور سے پہچان رہے تھے۔ وہ اکثر یہ بات کہنے لگے تھے کہ آدمی اپنی موت سے پانچ برس پہلے مرنا شروع ہو جاتا ہے اور میں اس دائرے کا درمیانی حصہ گزار چکا ہوں۔ یہی بات انھیں ہر لحظہ بے چین رکھتی تھی —

ایک خوف تھا جو ان پر مسلط تھا۔ مگر یہ خوف موت کا خوف نہیں تھا۔ وہ اولاد کے سر سے ایک سایہ ہٹ جانے کا خوف بھی نہیں تھا۔ وہ خوف دوستوں سے بچھڑ جانے کا خوف بھی نہیں تھا — وہ خوف غالب اور اقبال والے مضامین کے ادھورا رہ جانے کا خوف تھا۔ اس خوف نے ان کے اعصاب میں اس قدر تناؤ پیدا کر دیا تھا کہ ان کاموں کو جلد مکمل کرنے کی کوشش ہی دراصل اس سلسلے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

کام انھیں ہر آن، ہر نفس موت سے قریب کر رہے تھے، اور انہی کی وجہ سے وہ زندہ بھی تھے اور ایک ایسی کشمکش تھی کہ بالآخر تکمیل زندگی تو ہو گئی —

پر کام ادھورے رہ گئے —!

(حلقۂ ارباب ذوق (ادبی) کے خصوصی تعزیتی اجلاس میں ۲۴ر مارچ ۱۹۷۴ء کو پڑھا گیا)

اقبال اور بھوپال
صہبا لکھنوی کی مقبول کتاب
۱۵/- روپے
قیمتی ایڈیشن ۲۵/- ”

آنسہ طلعت • ڈاکٹر ممتاز حسن • ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی • شان الحق حقی

آفتاب حسن • ڈاکٹر جمیل جالبی • مشفق خواجہ • خواجہ حمید الدین شاہد

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی • ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی • علاء الدین خالد • حق نواز قیصرانی

محمد مطیع اللہ • ڈاکٹر سید ارشاد نوحی • محمد عنایت اللہ شیخ • بشیر محمود اختر

نواب مشتاق احمد خاں • سید قاسم محمود • بشیر احمد ساجد • سعید اختر درانی

حافظ محمد انور خاں • سعید احمد خاں

تعزیتی خطوط

آنسہ طلعت

(کوئٹہ)

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

میری پیاری امی جان ! السلام علیکم ——

پرسوں رات کو پیارے ماموں جان کی اچانک وفاتِ حسرت آیات کی قیامت خیز خبر سُن کر دل اور د
کی جو حالت ہے وہ لکھی نہیں جاتی۔ یہ قیامت خیز خبر سنتے ہی دل سے چیخیں نکل گیئں اور میرے کان یقین نہیں کر رہے
کہ یہ منحوس خبر واقعی ہمارے عزیز ترین ماموں جان کے متعلق ہے۔ اس منحوس خبر نے خاندان بھر میں حشر برپا کر دیا ہے
ایک قیامت ٹوٹ پڑی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب کی زندگی نے بھی اُن کے ساتھ ہی اپنا سانس روک لیا ہے۔
دل اور دماغ اُن کی موت کی خبر سے مارے غم کے پھٹ رہا ہے اور سمجھ نہیں آرہی کہ اس قلم سے کیا الفاظ نکل رہے ہیں
میری انتہائی بدقسمتی ہے جو اس قدر دور ہوں کہ اُن کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکی۔ دل چاہتا ہے کہ اڑ کر آپ سے اور پیاری مما
سے گلے مل کر چیخ چیخ کر اپنے آپ کو ختم کر ڈالوں، مگر میری بدقسمتی ہے کہ یہیں تڑپ رہی ہوں۔ پیارے ماموں جان ہماری
تھے۔ ایک ایسی شفیق اور بے مثال ماں جس کی شفقت سے ہم سب کا محروم رہ جانا موت سے بدتر اور قیامت خیز ہے
ایک بے مثال ہستی۔ بے مثال شوہر۔ بے مثال باپ اور بے مثال بھائی تھے۔ افسوس صد ہا افسوس کہ ہم سب نے مج
اور لاچار ہو کر اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے حوالے کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۝ میرا وجود تو یہاں ہے
مگر میرا دل آپ سب میں ہر وقت لگا ہوا ہے اور وہ پیاری ممانی جان جو کسی غیر کی موت کا صدمہ بھی برداشت نہ کر
تھیں، اُن پر یہ قیامت ٹوٹنا بڑی ستم ظریفی ہے۔ اُن کے اور بچارے سعید، جمیل، خلیل اور باقی سب چھوٹے بچوں کے د

سے دل غم سے پھٹ رہا ہے۔ وہ بچے جن کو ایک بے مثال اور والہانہ محبت کرنے والے باپ کی محبت کا فخر حاصل تھا آج ہمیشہ کے لیے بے سہارا ہو گئے۔ آپ کی بدقسمتی پر چیخیں مار مار کر دل روتا ہے جو ایک شفیق ترین بھائی کی بے پناہ محبت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی ہیں۔ آپ دونوں کی محبت بے پایاں تھی اور وہ آپ کو باوجود چھوٹی بہن کے ماں کے برابر درجہ دیتے تھے اور ماں کی طرح جان سے عزیز سمجھتے تھے۔ آپ کی بدنصیبی ہے جو اُن کو ہوش و حواس میں آخری بار دیکھ بھی نہ سکیں۔ یہ دل شکن اور جانکاہ غم ایک ایسا دائمی غم ہے جو زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔

غمِ ہجر اور ہجرِ دائمی پھر ہجر بھی تیرا
میں صابر ہی سہی پر صبر اتنا ہو نہیں سکتا

دراصل ایسی انمول ہستیوں کا نام اور اُن کی یاد کبھی موت مٹا نہیں سکتی۔ وہ اب بھی زندہ ہیں اور اُن کی محبت اور اُن کی یاد تا قیامت ہمارے دلوں میں زندہ رہے گی۔

آج میں نے اپنی الماری کھولی تو ماموں جان کا وہ خط جو ۱۹ر جولائی ۱۹۷۳ء کا لکھا ہوا میرے نام تھا نظر آیا جسے آنکھوں کو لگا کر میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ یہ خط پچھلے سال جب وہ بیمار ہوئے تھے تو مزاج پرسی کے میرے خط کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا۔ آہ یہ میرے نام اُن کا پہلا اور آخری خط تھا جس کے چند الفاظ یوں ہیں۔ "پچھلے بیس پچیس روز سے جو آرام کی زندگی میں گذار رہا ہوں، اُس سے مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک بادشاہ ہوں۔ اُس غریب مزدور کو یہ شاہانہ زندگی بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے جس کے پچھلے چالیس پچاس برس شاقہ محنت کرتے گزرے ہوں۔" واقعی انھوں نے باوجود کمزور صحت کے اپنے آپ کو انتہائی محنتوں میں مبتلا رکھا۔ ملک و قوم کی خدمت میں انھوں نے قیمتی ترین زندگی بے دھڑک صرف کر دی۔ خدا تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ وہ اس عظیم ترین ہستی کو اپنے جوارِ رحمت میں رکھے اور اُن کے لواحقین کو اس صدمۂ جاں کاہ کو برداشت کرنے کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین۔

مجھے اس صدمۂ عظیم میں شریک نہ ہو سکنے کا انتہائی رنج ہے اور ہمیشہ رہے گا اور مجھے ابھی تک اپنا سنگین جرم اور سنگ دلی لگتی ہے جو میں آپ سب تک نہیں پہنچ سکی، مگر وائے مجبوری۔ کل میں نے باوجود آپ کے منع کرنے کے تمام سامان لاہور جانے کے لیے باندھا اور سفر میں لے جانے کے لیے بچوں کی چیزیں تک رکھ لیں۔ لیکن صبح سویرے لاہور سے ایک فون آ گیا کہ آپ نے کہا ہے۔ "اب تمھارا آنا بے مقصد ہے۔ بچوں کو لے کر تنہا اتنا لمبا سفر نہ کرو"۔ میں نے انتہائی شکستہ دلی کے ساتھ اپنے فی الحال جانے کا پروگرام ملتوی کیا ہے۔ خدا مجھے توفیق دے کہ میں اُن کے چہلم میں شریک ہو سکوں۔ کرنل صاحب کو بھی ماموں جان کی وفات کا انتہائی صدمہ ہوا ہے۔ پرسوں سے انھیں کی باتیں کر رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے میرے کانوں میں تو اُن کے وہی الفاظ گونج رہے ہیں، جو انھوں نے بیگم روڈ میں آخری ملاقات پر ہمیں کہا تھا کہ میں اگست میں کوئٹہ آ کر تم لوگوں سے ملوں گا۔

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

اچھا امی جان خدا حافظ! — خدا ہم سب کو اس صدمۂ عظیم کے برداشت کرنے کی ہمت دے اور آپ کا سایہ ہمارے سر پہ سلامت رکھے —— آمین

ڈاکٹر ممتاز حسن

(کراچی)

میری بہن ــــــ ابھی ابھی میں نے اتفاقاً گھر پر ٹیلیفون کیا۔ تو وہ خبر سنی جسے میں جیتے جی سننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب خدا کو کچھ اور منظور رہو۔ تو انسان کیا کر سکتا ہے۔ انسان بہت ہی مجبور ہے۔ بڑا ہی بے بس ہے۔ اس کے دعوے بڑے بڑے ہیں مگر بے بنیاد۔

آج میری بیوی زندہ ہوتیں تو جو صدمہ انھیں ہوتا اس کا میں کچھ ہلکا ہی سا اندازہ کر سکتا ہوں۔ انھیں حمید احمد خاں سے اتنی محبت تھی کہ مجھ سے پوچھے بغیر اپنے اکلوتے لڑکے کا رشتہ آپ کے ہاں کرنے گئیں۔ بعد میں مجھ سے کہا کہ اُن کی تو لڑکی ہے ہی نہیں۔ میں نے کہا، مجھ سے پوچھا ہوتا تو میں ہی بتا دیتا۔

یہ خط اپنی طرف سے بھی لکھ رہا ہوں اور اپنی مرحوم بیوی کی طرف سے بھی۔ میں حمید احمد خاں کے براتیوں میں سے تھا۔ آج ان کے سوگواروں میں ہوں، کاش یہ ماتم میری قسمت میں نہ لکھا ہوتا۔

میں نے اس سے پہلے آپ کو کوئی خط نہیں لکھا۔ آج مجبور ہو کر لکھ رہا ہوں۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں میں آپ کے اور بچوں کے کس کام آ سکتا ہوں۔ آپ اس خط کا جواب دینے کی کوشش نہ کریں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ صدمہ کیا چیز ہے۔ البتہ عزیز سعید[1] سے کہہ دیجیے کہ وہ مجھے بالتفصیل لکھیں اپنے اور اپنے بھائیوں کے متعلق۔ لاہور آؤں گا تو حاضر ہوں گا۔

بیوی گئی تو گھر برباد ہو گیا۔ اب حمید احمد خاں گئے تو لاہور میرے لیے خالی ہو گیا۔ کم و بیش پچاس سال کی دوستی اس دنیا میں رہی، خدا جنت نصیب کرے اب کون ہے جو ان سا شریکِ کار، غم گسار، دل نواز دوست ہوگا۔

حمید احمد خاں میرا دوست تھا۔ میرا محسن تھا۔ اس کے احسانات مجھ پر اتنے ہیں کہ میں ان کا کبھی بھی شکریہ ادا نہیں کر سکوں گا۔

میں کرم آباد میں کئی بار ان کا مہمان رہا ہوں، ان کے ساتھ کرکٹ کھیلا ہوں، اب وہاں جاؤں گا تو ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے ــــ یہ بھی ہونا تھا۔

خدا آپ کو اور بچوں کو صبر دے

ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی

(پشاور)

برادر مکرم ــــــ　　السلام علیکم!

رات اقبال عظیم کے گھر خبر میں سن رہا تھا۔ اور خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پُر ملال کی اطلاع پا کر دل دھک سے ہو گیا۔ بات واضح تھی مگر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کیسا کچھ قلق ہوا نا قابلِ بیان ہے۔ اب صبح خط لکھنے بیٹھا تو صاحبزادگان میں سے ایک نام بھی یاد نہ آیا۔ گھر کا پتہ البتہ ذہن میں ہے۔ جناب محمود احمد خاں صاحب اور جناب حامد علی خاں صاحب کے دولت کدوں کا پتہ میرے پاس محفوظ نہیں۔ آپ کو ویسے بھی لکھتا۔ مگر اب دوسروں کے حصے کا پیام اور مضمون بھی آپ ہی سے عرض کروں گا۔

---

[1] میاں سعید کا خط جو انھوں نے اس خط کے جواب میں لکھا ہے۔ آیندہ صفحات میں ملاحظہ کیجیے۔ (ص)

موت العالم موت العالم کی مثل خاں صاحب پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ اب ان جیسا جامع اوصاف کہاں تلاش کیجیے گا۔ علم و فضل کی عظمت اور جاہ و شرف کی بڑائی کے ہوتے ہوئے ایسا انکسار، اخلاص اور صمیمیت اب کہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ آپ سے تو مرحوم و مغفور کے بے حد خصوصی تعلقات تھے، مگر مجھے بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ میرے اوپر وہ کرم فرماتے تھے جو ہر ایک پر خاص نہ تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کا حسن اخلاق ہر شخص کے ساتھ ایسا تھا کہ وہ انھیں اپنا سمجھنے میں حق بجانب تھا۔

اس وقت بہت سی پرانی باتیں یاد آرہی ہیں۔ اور دل پر چوٹ لگا رہی ہیں۔ جناب محترم محمود احمد خاں صاحب اور جناب مکرم حامد علی خاں صاحب کو یہ صدمہ بھی دیکھنا پڑا۔ خدا کی مشیت ہے! طبیعت کی یہ شگفتگی اور مزاج کی یہ شستگی اور زبان و ادب کی یہ شیفتگی اب کہاں ملے گی۔ خاں صاحب مرحوم کا حسن اخلاق اور مشفقانہ برتاؤ بزرگان سلف کا فقید المثال نمونہ دکھاتا تھا۔ ان کی جدائی عزیزوں کے لیے جس قدر سخت اندوہناک ہے۔ علمی اور ادبی حلقوں کے لیے بھی ویسی ہی دل دوز و جاں گسل ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

وقار بھائی! خان صاحب مرحوم کے اہل خاندان پر جو پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔ مگر میں یہی سوچ سوچ کے ہلکان ہوا جا رہا ہوں کہ آپ اس وقت جس عظیم صدمے سے دوچار ہوئے ہیں، خدا کرے آپ میں اس کی برداشت کی ہمت و حوصلہ پیدا ہو۔ رب العزت ہی آپ سب کو اور خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اہل و عیال کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے گا۔ اور اپنے فضل و کرم سے نوازے گا۔ و ما توفیقی الا باللہ۔

جہان علم و ادب اور دنیائے زبان و نقد خاں صاحب مرحوم کا بدل نہیں پیدا کر سکتی، اور یہ ایسا نقصان ہے کہ ملک اور قوم جتنا ماتم کرے کم ہے۔

وما کان قیسٌ هلکه هلك واحدٍ
ولکنه بنیان قومٍ تهدّما

ایسے صاحبان علم و شرف اور جامع اوصاف و کمالات کبھی کبھی پیدا ہوا کرتے ہیں!! ہم ان کی جدائی سے انفرادی اور اجتماعی طور پر جس صدمۂ عظیم سے دوچار ہوئے، اس کی کسی طرح تلافی ممکن نہیں۔ میں اس اندوہناک قلق و غم میں آپ سب کے ساتھ ہوں۔ ازراہ کرم ڈاکٹر محمود احمد خاں صاحب قبلہ، جناب حامد علی خاں صاحب اور مرحوم کے صاحبزادگان گرامی قدر تک میرا سلام و پیام پہنچا دیجیے۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

شان الحق حقی
(کراچی)

برادر مکرم و محترم حامد علی خاں صاحب!　　　　السلام علیکم ——

ایک مدت کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں، کاش کہ اس کے لیے یہ تقریب نامسعود پیدا نہ ہوئی ہوتی، جو قدرت کی ستم ظریفی سے پیدا ہوئی۔ حمید احمد خاں صاحب آپ ہی کے بڑے بھائی نہ تھے۔ میں بھی انھیں ایسا ہی سمجھتا تھا

اور میری طرح اور بہت سے ہوں گے جو ان کی ذات سے ایسی ہی قرابت محسوس کرتے ہوں گے اور اس پر فخر بھی۔ ایسے شفیق، ایسے وضیع، ایسے لئیق، ایسے عمدہ لوگ اب ڈھونڈے نہ ملیں گے۔ ان کی ذات ایک نعمت تھی جو ہمارے ہاتھ سے جاتی رہی۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون ہ

میری طرف سے اس سانحے پر دلی تعزیت قبول فرمائیں اور دیگر متعلقین کی خدمت میں بھی عرض کر دیں۔

ایک قرارداد تعزیت بھی ملفوف کر رہا ہوں جو آج صبح اس ادارے کے ایک جلسے میں پاس کی گئی۔

آفتاب حسن
(کراچی)

مشفق مکرم حامد علی خاں صاحب!　　سلام علیک

میں ہنڈی میں تھا کہ ریڈیو میں یہ دل شکن خبر سنی کہ مشفق محترم پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ہم سے جدا ہو گئے۔ میں کیا عرض کروں کہ مجھے کس قدر تکلیف ہوئی۔ میرا حال اس سپاہی کا ہے کہ جس کے سارے جنرل آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہوں اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑے تو کس طرح اور کرے تو کیا۔

میں نے اس ۲۵ سال کے عرصے میں بہت لوگوں کو دیکھا اور آزمایا۔ لیکن پروفیسر صاحب مرحوم کی جیسی شخصیت مجھے ڈھونڈے سے بھی نہیں ملی ـــــ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں زیادہ کیا کہوں اور کیا لکھوں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے سارے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی
(کراچی)

محب گرامی قدر!　　سلام مسنون ـــــ

محترمی پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی وفات کی خبر کچھ اس طرح اچانک صبح کو اخباروں میں پڑھی کہ یقین نہیں آیا۔ میں اس خبر سے اس قدر متاثر ہوا کہ آج تین دن سے خط لکھنے کی کوشش کے باوجود خط نہ لکھ سکا۔ حمید احمد خاں صاحب مرحوم کو میں نے آپ کے توسط سے پہچانا، اور اس طرح پہچانا، کہ میں اُن کا عاشق ہو گیا۔ کیسے اچھے آدمی تھے۔ صحیح معنی میں بڑے آدمی۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور فردوس بریں میں درجاتِ بلند عطا فرمائے۔ اُن کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔ نہ معاشرتی دنیا میں اور نہ دل کی دنیا میں۔ یہ خط مجھے ان کے پس ماندگان کو لکھنا چاہیے تھا۔ لیکن ان پس ماندگان میں، میں خود بھی شامل ہوں اور آپ کو بھی شامل سمجھتا ہوں۔ خدا آپ کو صبر عطا فرمائے اور مرحوم کے اُن کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا حوصلہ بھی جنھیں وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔ تہذیب اور تعلیم بھی طباعت کی منزل میں تھی۔ اقبال پر اُن کی کتاب بھی چل رہی تھی، اور غالب پر بھی۔

اور نہ معلوم کیا کیا وہ چھوڑ گئے ہوں گے۔ اب مجلس کو آپ ہی سنبھال سکتے ہیں۔ خدا کرے اربابِ حل و عقد کے ذہن میں یہ بات آ جائے۔

امید ہے آپ بعافیت ہوں گے۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں آداب۔

مشفق خواجہ

(کراچی)

محترمی و مکرمی! آداب ——

پروفیسر حمید احمد خان کے انتقال کی المناک خبر سنی، یہ حادثہ ایسا غیر متوقع اور اچانک ہے کہ دل کو یقین ہی نہیں آتا۔ افسوس کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے اُس شخص کو بھی چھین لیا جو ہماری تہذیبی و ثقافتی قدروں کا آخری نمایندہ تھا۔ اب ایسے لوگوں کے لیے ہماری آنکھیں ہمیشہ ترستی رہیں گی۔ اُن کی وفات ایک قومی المیہ تو ہے ہی، میرے لیے ذاتی سانحہ بھی ہے، اور آپ کے لیے تو یقیناً ناقابلِ برداشت صدمہ ہے۔ آپ سے جو اُن کے خصوصی تعلقات تھے، باہمی محبت کا جو رشتہ تھا۔ اس کی مثالیں اس زمانے میں کمیاب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعزیت کا خط میں آپ کو لکھ رہا ہوں۔

خداوند تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اس صدمے کے جھیلنے کی ہمت عطا فرمائے۔

خواجہ حمید الدین شاہد

محترمہ　سلام مسنون۔

میرے کرم فرما پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کو مرحوم و مغفور لکھتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ رہا ہے، میری آنکھوں میں آنسو ہیں اور میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ رحلت کی اچانک خبر سُن کر مجھے بے انتہا دلی صدمہ ہوا کیونکہ میرے دل سے وہ بہت قریب تھے۔ مجھ پر اُن کی جو عنایاتِ بے پایاں تھیں، اب ایک ایک کر کے یاد آ رہی ہیں۔ مرحوم کی شرافت اور اپنے ملنے والوں پر شفقت اور محبت کی اس دنیا میں مثال نہیں مل سکتی۔ وہ میرے بے غرض محسن اور ایک بلند مرتبت انسان تھے۔ افسوس پاکستان ایک ایسی عظیم ہستی سے محروم ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اس اندوہناک سانحے کا جو صدمہ آپ کو اور آپ کے صاحبزادوں کو ہوا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ ایسا غم ہے جو بھلایا نہیں جا سکتا۔

اللہ پاک آپ کو اور آپ کے صاحبزادوں کو اس غم کے برداشت کرنے کی طاقت اور صبر جمیل کی توفیق بخشے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

میں، میری بیوی اور بچے اس غم میں آپ کے شریک ہیں اور آپ کے لیے درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہیں۔

اللہ بس باقی ہوس۔

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی

(کراچی)

عزیز القدر سلمہٗ! سلام مسنون ——

آپ کے والد گرامی پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے انتقال پُر ملال کا حال معلوم کر کے از حد رنج و افسوس ہوا۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں کہ میں اُن موزوں الفاظ کے ذریعہ اُس غم کا اظہار کر سکوں۔ مرحوم و مغفور جن بلند ترین اقدارِ زندگی کے مالک تھے۔ اُس کا اندازہ دوسرے آدمی زیادہ کر سکتے ہیں۔ مجھے از حد افسوس ہے کہ مجھے مرحوم

سے صرف ایک دفعہ ہی شرف تعارف حاصل ہوا۔ لیکن مرحوم و مغفور نے اپنے اخلاق حمیدہ اور اوصاف جلیلہ کے سبب اس قدر کثیر مصروفیات کے باوجود میری خاطر اتنا وقت دیا کہ جو میرے تصور سے بالا تھا۔ اُن کی پاکیزہ گفتگو، وہ شستہ ادبی مذاق اور انکسار اور شفقت مجھے ساری عمر یاد رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ تقریباً ۲ گھنٹے انھوں نے میرے لیے مخصوص کر دیے اور میں مرحوم کے گفتار ستودہ اور آدابِ حمیدہ کے باعث اُن کا بے دام غلام بن گیا۔

ہائے ہائے کیسے بلند انسان پیوند زمین ہو گئے۔ جو ہماری زندگی، ہمارے معاشرے اور ہمارے بزرگوں کی پاکیزہ زندگی کا پاکیزہ نمونہ تھے۔

اُن کا مرنا آپ کا اور آپ کی والدہ صاحبہ اور اُن کے اعزہ کا غم نہیں۔ ہم سب کا غم ہے۔ ایسوں کے مرنے پر جس قدر انسان روئے اتنا کم ہے۔ میں کس طرح آپ کو صبر کی تلقین کروں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کے اُٹھ جانے سے ایک عظیم خلا واقع ہو گیا ہے۔ اور اُن کی جگہ کسی طرح پُر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ایسوں کے اُٹھ جانے پر کیوں نہ روئیں لیکن مرضی الٰہی کے سامنے ہم سب کا سر تسلیم خم ہے۔ میری جانب سے اپنی والدہ گرامی، اپنے بھائی صاحبان کی خدمت میں یہ چند کلمات تعزیت پیش کر دیں۔ خدا آپ سب کو اس صدمہ کے برداشت کی ہمت عطا کرے۔ اور مرحوم کے درجات بلند کرے۔ میں لاہور آیا تو خود حاضر ہو سکوں گا۔

بہر حال میں آپ سب کے ساتھ اس غم میں شریک ہوں۔ خدا آپ سب کو صبر جمیل عطا کرے۔

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

(پشاور)

محترمہ —— آج کے اخبار میں یہ افسوسناک خبر پڑھ کر بے حد دُکھ ہوا کہ میرے مشفق و مہربان پروفیسر حمید احمد خان صاحب اپنے خالق سے جا ملے۔ افسوس صد افسوس۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم سے زیادہ نیک دل، مخلص، ہمدرد اور شریف انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ علمیت و انسانیت کے اس پیکر سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ اپنے غم میں مجھے بھی اور میری بیوی کو بھی شریک جانیے۔ خلوصِ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اور سب بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے —— آمین ثم آمین

علاء الدین خالد

(کراچی)

محترمہ: السلام علیکم ——

پرسوں اخبارات میں استاذ المکرم جناب حمید احمد خان صاحب کی رحلت سے ناقابلِ بیان دھچکا لگا۔ مرحوم میرے استاد تھے۔ میں اسلامیہ کالج لاہور میں ۱۹۳۵-۳۶ء تک ان کا شاگرد رہا۔ اور اُن کی شائستگی، محبت، انسانیت کا پرتو میری زندگی میں اُسی وقت پڑا، جسے میں آج بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میں اپنے آپ کو اُن خوش قسمت ہزاروں طلبہ میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ جن کو اُن کی شفقت حاصل تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں جو رشتہ قایم ہوا تھا،

وہ تا زیست قایم رہا بلکہ اُسے تقویت ہی حاصل ہوتی رہی ۔ ان کی پدرانہ محبت سے میں محروم ہوگیا ۔۔۔۔ اس سے بڑھ کر میری کیا بدنصیبی ہوگی ! ــــ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

ان کی رحلت میرا، آپ ہی کا نقصان نہیں ۔ بلکہ یہ ایک عظیم قومی نقصان ہے ان کی زندگی سے ہزاروں شمعیں روشن تھیں ۔ میں خدائے برتر و بزرگ سے رحمۃ اللعالمین کے صدقے میں دعاگو ہوں کہ وہ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ۔

اُن کی زندگی انسان دوستی کا آئینہ تھی ۔ ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

میرے لایق کوئی خدمت ہو تو میں اس کی بجا آوری اپنے لیے باعثِ فخر محسوس کروں گا ۔

حق نواز قیصرانی

(بردٹ - قبائلی علاقہ)

بہ عالی خدمت برادر محترم خاں صاحب سلمہٗ تعالیٰ !　　　السلامُ علیکم و رحمت اللہ و برکاتہٗ

آہ ! اپنے استاذ محترم اور محسن و مشفق شخصیت کی تعزیت کے بارے میں کیا لکھوں اور کیسے لکھوں یقین مانیے کہ مرحوم کی وفات سے جو دلی صدمہ اور گہرا رنج آپ کو ہوا ہے ۔ ہم ہزاروں فرزندانِ معنوی اس غم و اندوہ میں آپ کے ساتھ برابر کے شریک ہیں ۔ میرے مرحوم کے ساتھ ۱۹۶۰ء سے نیازمندانہ مراسم تھے ۔ میں نے اُن کے سایۂ عاطفت میں تعلیم پائی اور مرحوم نے مجھے عملی زندگی میں بھی ہمیشہ یاد رکھا ، اُن کے تقریباً دو درجن خطوط میرے پاس محفوظ ہیں اور میرے لیے سرمایۂ افتخار ہیں ۔ اُن کا آخری نوازش نامہ ۲۴ر فروری ۱۹۷۴ء کا تحریر کردہ ہے ۔ اُن کے ہزاروں شاگرد ہی نہیں بلکہ وہ لوگ جنھیں کبھی اُن سے واسطہ پڑا آج اُن کے غمِ فرقت میں اشک بار ہیں ؎

صد موج را ز رفتنِ خود مضطرب کند

موجے کہ بر کنار رود از میانِ ما

آپ نے ملک و ملت کے لیے جس خلوص و ایثار کے جذبہ سے کام کیا وہ بے مثل اور دورِ حاضر میں ایک عظیم کارنامہ ہے ۔ عملی زندگی کی مجبوریوں کی بنا پر میں حاضرِ خدمت نہیں ہو سکتا ۔ لیکن جوں ہی مجھے وقت ملے گا ، میں انشاء اللہ ضرور آپ کے ہاں پہنچوں گا اور مرحوم و مغفور کی لحدِ مبارک پر اصالتاً فاتحہ خوانی کروں گا ۔ مرحوم کی شخصیت سے میرا اسٹاف بھی نہایت متاثر تھا اور آج صبح اسکول میں اسٹاف میٹنگ میں فاتحہ خوانی کر کے مرحوم کو ایصالِ ثواب کیا گیا ۔ دل چاہا تھا کہ مرحوم کی یاد میں ایک طویل تعزیت نامہ لکھ کر غم کا بوجھ ہلکا کیا جائے ۔ لیکن ع

بیتی ہے وہ دل پہ کہ نہیں تابِ سخن

آہ - پروفیسر حمید احمد خاں صاحب مرحوم ۔ "آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے" ۔

کام تیرا زندہ ہے ، نام تیرا باقی ہے

تیرے نام سے روشن ہے محرابِ وطن

ہم یہ "چند دن" والی بات مذاق سمجھتے رہے۔ ہمیں یوں سمجھنے کا حق بھی تھا۔ ہم زندہ جو تھے۔ لیکن زندہ تو ابا بھی تھے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس کے ساتھ وہ سفر کے لیے بھی پوری تیاری کر رہے تھے؟

۲۱ مارچ کو فیکٹری میں میری صبح کی شفٹ تھی۔ اس شفٹ کے لیے میں صبح پانچ بجے گھر سے نکلتا ہوں اور سہ پہر تین بجے لوٹتا ہوں۔ حسبِ معمول میں تین بجے گھر پہنچا تو ابا کو آداب کہنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد ابا میرے پیچھے وہاں آئے اور کہنے لگے کہ آج فائقہ (میری بیوی) کی سال گرہ ہے۔ تمھاری امی چاہتی ہیں کہ ایک کیک منگوایا جائے اور بھائی صاحب (حامد علی خاں صاحب) اور تمھاری خالہ (یعنی فائقہ کے والدین) کو بلا کر اکھٹے چائے پی جائے۔ کچھ دن پہلے انھیں AMERICAN CENTRE کی طرف سے EUGENE O'NEILL کے ڈرامے LONG DAY'S JOURNEY INTO NIGHT کی فلم دیکھنے کی دعوت ملی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ ابا آج کل دن رات اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، فلم کی تفریح ان کے لیے اچھی ثابت ہوگی، ان پر زور دیا کہ وہ فلم جا کر دیکھیں۔ شاید مجھے اور وقار کو (میرے چھوٹے بھائی) جوان کے ساتھ فلم دیکھنے گئے) خوش کرنے کے لیے وہ راضی ہوگئے۔ ان کو پانچ بجے جانا تھا۔ کہنے لگے کہ "مہمانوں" کو ذرا دیر میں آنے کے لیے کہنا، تاکہ جب میں سات بجے کے قریب لوٹوں تو میں بھی سال گرہ میں شریک ہوسکوں۔ لیکن امریکن سنٹر میں بات لمبی ہوگئی، اور ابا آٹھ بجے سے کچھ پہلے گھر واپس پہنچ سکے۔ چچا حامد علی خاں صاحب اس سے چند منٹ پہلے اپنے گھر کو روانہ ہو چکے تھے۔ میرے ایک اور خالو اور خالہ صحن میں بیٹھے تھے۔ ابا بہت خوشی سے وہاں ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ مجھے صبح فیکٹری جانے کے لیے پھر چار بجے اٹھنا تھا۔ اس لیے میں چند منٹ بعد وہاں سے سونے کی تیاری کے لیے اٹھ گیا۔ اگلے دن صبح دس بجے منصور (میرے چھوٹے بھائی) نے مجھے فیکٹری میں فون کیا، ابا کی طبیعت خراب ہوگئی ہے آپ چھٹی لے کر آسکیں تو آجائیے۔ بارہ بجے کے قریب میں گھر پہنچا تو ابا ہسپتال جا چکے تھے۔ وہاں پہنچا۔ ابا بے ہوش تھے۔ ہم سب سکتے میں تھے۔ دو بج کر پینتیس منٹ پر تین ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں اور اپنے بہت سے عزیزوں کی موجودگی میں ابا نے اس سرحد کو عبور کر لیا اور (م ۳) سفر پر روانہ ہو گئے جس کے لیے وہ تیار تھے۔

۲۲ مارچ کی صبح کو وہ حسبِ معمول دفتر جانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ اچانک ایک قے آئی، غسل خانے دوڑے گئے اور پھر اپنے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ امی اور وقار اور فائقہ فوراً اُن کے پاس پہنچے۔ منصور بازار سے لیموں اور سیون اپ لینے دوڑے۔ خود ابا نے اسے معمولی بات سمجھا۔ وقار سے کہنے لگے کہ میں ٹھیک ہی ہوں اور ابھی دفتر چلوں گا۔ ڈاکٹر کو بلانے سے کچھ روکا۔ لیکن قے کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔

وقار ڈاکٹر کو لینے دوڑے۔ امی سمجھیں کہ صورت خاصی سنگین ہے۔ لیکن ابا نے کوئی خاص بات نہیں کی۔ (وہ تو عرصے سے اس کے لیے تیار تھے اور ہمیں بھی تیار کرنے کی کوشش کرتے تھے) بے ہوش ہونے سے چند لمحے پہلے اُنھوں نے امی کی طرف دیکھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ شاید ہمیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ شاید اس مسکراہٹ میں کچھ معذرت بھی تھی اور کچھ حسرت بھی۔ پھر انھوں نے آنکھیں بند کرلیں اور ہوش کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے۔

چند دن پہلے ابا کو اسلامیہ کالج کے زمانے کے نوجوان دوستوں میں سے ایک صاحب ریروفیسر اختر الدین، شعبۂ انگریزی، اسلامیہ کالج، لاہور) ملنے کے لیے دفتر آئے۔ اختر صاحب بتاتے ہیں کہ ملاقات بہت خوش گوار رہی۔ قہقہے بلند ہوئے لیکن جب انھوں نے ابا سے یہ کہا کہ پرنسپلی اور وائس چانسلری کے بعد اُن کا موجودہ کام اور دفتر تو گوشۂ عافیت ہے تو ابا نے جو جواب دیا، اس پر پروفیسر اختر الدین اِسٹنگڈ ہوگئے۔ ابا نے بات سنی تو اُن کے چہرے پر سے مسکراہٹ کی جگہ سنجیدگی نے لے لی اور کہنے لگے، اختر صاحب، گوشۂ عافیت تو قبر ہے اور اِس کا اب مجھے انتظار ہے۔ اختر صاحب حیران تھے۔ ابا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، آپ واپس جائیں تو TENNYSON کی نظم Crossing the Bar پڑھیے گا۔ یہ نظم میں نے اب پڑھی ہے۔ آپ کے لیے یہاں نقل کر دیتا ہوں۔

Sunset and evening star,
And one clear call for me!
And may there be no moaning of the bar,
When I put out to sea,

But such a tide as moving seems asleep,
Too full for sound and form,
When that which drew from out the boundless deep,
Turn again home.

Twilight and evening bell,
And after that the dark!
And may there be no sadness of farewell,
When I embark;

For tho' from out our bourne Time and Place
The flood may bear me far,
I hope to see my Pilot face to face
When I have crost the bar.

ابا نے پچھلے چند ماہ میں بعض احباب کو جو خط لکھے ہیں، اُن میں سے تین کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ہم نے ان کو پڑھ کر ابا سے ملاقات کا لطف اٹھایا ہے۔

Board for advancement of literature

(Copy)　　　　10.8.1973

My dear Yahya,

I was delighted to receive your letter a couple of days ago. You and the Family Planning Association are doing useful work, and my best wishes are with you. But formal involvement with membership of committees is now over for me. My doctors advise me to spare myself as much as I can. I am now a "weary river" in Swinburne's phrase – a phrase which will come back to your mind in the following famous stanza:

From too much love of living,
　From hope and fear set free,
We thank with brief thanksgiving
　Whatever gods may be
That no life lives for ever;
That dead men rise up never;
That even the weariest river
　Winds somewhere safe to sea.

I am sure you will be good enough to excuse me if I fail to accept the honour of becoming a member of your standing committee. There is a time when one must retire from some of one's former social activity. That time has now come for me. This does not mean, however, that I shall not be at your service whenever you might need my advice informally. All good wishes.

Yours Sincerely,
Sd/ Hamid Ahmad Khan.

Rana Md. Yahya Sahib,
Hony. Gen. Sec'ty.
Family Planning Assot. Lahore.

"۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۳ء

برادرم - السلام علیکم!

آپ کا ۳ر اکتوبر کا نوازش نامہ وصول ہوئے دو ہفتے سے زیادہ گزر گئے۔ میں بعد معذرت "ندیم نمبر" سے غیر حاضر رہنے پر مجبور ہوں۔ توفیق تو باندازۂ ہمت نصیب ہوئی ہے اور ہمت جوانی اور صحت کا عطیہ ہے۔ اس لیے توفیق پر میرا حق بہت کم باقی رہ گیا ہے۔ روزانہ دفتری کام کے بعد رہی سہی سکت اپنی دو زیرِ طبع کتابوں (اقبال کی شخصیت اور شاعری اور تعلیم و تہذیب) کے پروف دیکھنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے معذور تصور فرمائیں گے۔ تاہم امتثال امر کے طور پر ایک مختصر نثر پارہ "ندیم نمبر" کے لیے منسلک ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پر جو کتاب چھپی وہ مرحوم و مغفور کے ادارے (ثقافت اسلامیہ) نے شایع کی تھی۔ میں نے آپ کا گرامی نامہ ان صاحبوں کو بھجوا دیا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ کتاب کی ایک جلد انھوں نے بتاریخ ۶ر اکتوبر آپ کی خدمت میں بھیج تھی۔ امید ہے کہ "افکار" میں تبصرہ شایع ہو جائے گا۔　　　　والسلام

خیر طلب

حمید احمد خاں"

حضرت صہبا لکھنوی صاحب

مدیر "افکار"

مکتبہ افکار، رابسن روڈ، کراچی

"۲۸ر نومبر ۱۹۷۳ء

برادر مکرم فاطمی صاحب! السلام علیکم

۲۱ر نومبر کے نوازش نامے کی رسید ٹیلیفون پر عرض کر چکا ہوں۔ آج غالب (شخص و شاعر) (*Ghalib, Man and Poet*) کے پہلے دو باب پیشِ خدمت ہیں۔ حیرت ہے کہ لکھی ہوئی چیزوں کی ترتیب میں اس قدر وقت لگتا ہے۔ بہرحال آپ یہ صفحات اطمینان سے ملاحظہ فرمالیں اور مزید کام کے سلسلے میں اپنی رائے ظاہر فرما دیں تو یہ کام بشرط زندگی جاری رہے گا۔

ایک معذرت ابھی کر دوں۔ دسمبر میں علامہ اقبال کی ولادت کا جشن صد سالہ منایا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی کے احباب سے مہینوں پہلے وعدہ کر بیٹھا تھا کہ اس مرتبہ سالانہ خطبۂ اقبال میں پڑھ دوں گا (مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی!) مطلب یہ کہ دسمبر کا مہینہ اس خطبے کی تیاری کی نذر ہو جائے گا۔ جنوری سے انشاء اللہ غالب کا مسودہ حاضرِ خدمت ہوتا رہے گا۔ یہ کام اب اس منزل میں ہے کہ جنوری سے اسے بہرحال اوّلیت حاصل رہے گی۔

والسلام بصد ندامت

مخلص

حمید احمد خاں"

شاید فروری کے آخر کی (یا مارچ کے شروع کی) بات ہے کہ ابا کے نام آپ کا ایک خط آیا۔ خط کیا تھا، فارسی کا شعر تھا، جو آپ نے اپنی چند ہفتے پہلے مرحوم ہونے والی بیوی کو یاد کرکے لکھا تھا۔ ابا نے مجھے وہ دکھایا اور شعر کا ترجمہ کرکے سنایا۔

بہار بود و تو بودی و عشق بود و امید
بہار رفت و تو رفتی و ہر چہ بود گذشت

کہنے لگے "بے چارے ممتاز حسن نے یہ لکھا ہے۔ چند دن پہلے اسی طرح کا ایک اور خط" بھی انھوں نے مجھے بھیجا تھا۔ وہ بھی دکھایا۔ جس میں آپ نے یہ شعر لکھے تھے۔ ایک پیڈ کے کاغذ پر صرف یہ شعر تھے ۔

I called for madder music & for stronger wine
But when the feast is finished & the lamps expire
Then falls thy shadow, Cynara! the night is thine!

میں نے اُن سے کہا کہ یہ خط آپ سنبھال لیجیے اور انھوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔ اس واقعہ کے چند دن بعد اُنھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ میں تمھیں وہ Cynara والی نظم سنانا چاہتا ہوں۔ میں پلنگ پر اُن کے ساتھ بیٹھ گیا اور اُنھوں نے اپنی Oxford Book of Modern Verse کھول کر وہ نظم مجھے اس طرح سنائی جیسے ہی سنا سکتے تھے۔ اُن کی آواز کچھ بھرا گئی اور میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ معلوم نہیں اُس وقت یوں کیوں ہوا، کہ اب میں نے یہ نظم پھر پڑھی ہے، اور میں بچوں کی طرح رویا ہوں:

Last night, ah, yesternight, betwixt her lips and mine
There fell thy shadow, Cynara! thy breath was shed
Upon my soul between the kisses and the wine;
And I was desolate and sick of an old passion,
Yea, I was desolate and bowed my head;
I have been faithful to thee, Cynara! in my fashion.
All night upon mine heart I felt her warm heart beat,
Night-long within mine arms in love & sleep she lay;
Surely the kisses of her bought red mouth were sweet;
But I was desolate & sick of an old passion,
When I awoke and found the dawn was gray;
I have been faithful to thee, Cynara! in my fashion.

I have forgot much, Cynara! gone with the wind,

زندہ کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان جرمن فورم لاہور میں اقبال پر جلسوں کا ایک سلسلہ ہو رہا تھا، جو پورا ہفتہ جاری رہا۔ ابا کو بطور فورم کے صدر کے ہر جلسے میں جانا تھا۔ مجھ سے بھی انھوں نے پوچھا، لیکن دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے میں نے معذرت کی۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ لیکن ایک دن ممتاز حسن صاحب تقریر کرنے آرہے ہیں۔ اُس دن تم ضرور چلنا۔ وہ تمھیں دیکھ کر خوش ہوں گے۔ سو اُس روز میں بھی گیا، اور آپ کے اور ابا کے ساتھ چند گھنٹے گزارنے کا لطف ایک دفعہ پھر اُٹھایا۔ اس قسم کی بات کرنا ابا کی خاصیت تھی۔ وہ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں، اپنے بچوں، عزیزوں اور دوستوں سے شفقت و مروت نہ چھوڑتے تھے۔ اُن کے لیے یہ زندگی کی ایک بہت قیمتی چیز تھی۔

اب میں خط ختم کرتا ہوں۔ آپ لاہور آئیں تو ہمیں ضرور اطلاع دیجیے گا۔　　والسلام

خاکسار سعید

تعزیتی قراردادیں

(۱)

مجلسِ ترقیٔ ادب کی منتظمہ کا اجلاس ۷، مارچ ۱۹۷۴ء کو مجلس کے دفتر میں صدرِ مجلس ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اراکینِ مجلس کے علاوہ جناب عبدالحفیظ کاردار نے بھی شرکت فرمائی۔ ذیل کی قرارداد اس اجلاس میں پیش اور منظور ہوئی:۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ناظم مجلس ترقی ادب لاہور کی وفات ہماری ملکی اور قومی زندگی کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ مرحوم نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسلام، پاکستان، ادب اور تہذیب کی خدمت میں صرف کیا اور مرتے دم تک کام کو ایک مقدس فریضہ سمجھ کر انجام دیتے رہے۔ مرحوم کی حیثیت پاکستان کے ایک عظیم شہری، ایک سچے اور درد مند مسلمان، علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی کے لیے ایک مضبوط ستون کی تھی۔ اس ستون کا گر جانا ایک ایسا نقصان ہے جس کا احساس وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہے گا۔ مجلس ترقی ادب کے ناظم کی حیثیت سے انھوں نے پچھلے چند برس میں جو خدمات انجام دیں، ادب اور تہذیب کی زندگی میں ان کا مستقل مقام ہے۔ ان کا کیا ہوا کام اور ان کی دکھائی ہوئی راہ آیندہ نسلوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دے گی۔

مجلس ترقی ادب کا یہ اجلاس قوم کے اس عظیم فرزند کی ناگہانی وفات پر اپنے شدید رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی وفات کو قوم اور ملک کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے عزیزوں اور سوگواروں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

مجلس کے سب اراکین مرحوم کے اعزہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

(۲)

۲۶ مارچ ۱۹۷۴ء پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ، طلبا وطالبات کا یہ اجتماع پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی بے وقت اور ناگہانی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔

پروفیسر حمید احمد خان صاحب برصغیر پاک وہند کے علمی، تعلیمی، ادبی اور تحقیقی حلقوں میں نہایت بلند مقام رکھتے تھے۔ غالب اور اقبال پر ان کی تحقیقی اور تنقیدی تحریریں سند کا درجہ رکھتی ہیں اور بڑے بڑے محققین اور نقاد ان کا حوالہ دیتے ہیں، مرحوم نے پاکستان کی تعلیمی زندگی میں بھی گراں بہا خدمات انجام دیں، اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے ان اداروں میں علم وادب کو فروغ دیا، اور انسانیت، انسان دوستی، محبت اور دوسری اعلیٰ قدروں کے چراغ روشن کیے۔

پنجاب یونیورسٹی میں انھوں نے مسلمانوں کی تہذیبی اور ادبی تاریخ اور غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ان کی تمام تصانیف کو یونیورسٹی کی طرف سے شایع کرنے کے منصوبے بنائے اور ان کو عملی جامہ پہنایا۔ پاکستانی قوم ان کے اس کارنامے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

خان صاحب کی شخصیت میں مشرقی ومغربی تہذیب وثقافت کی بہترین روایات پائی جاتی تھیں، وہ انگریزی زبان وادب کے پروفیسر تھے لیکن مشرقی زبانوں اور ان کے ادبیات سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ہمیشہ اورینٹل کالج کے معاملات میں گہری دلچسپی لی اور ان کے زمانے میں کالج کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(۳)

پروفیسر حمید احمد خان کے سانحۂ ارتحال پر انجمن ترقی اردو کراچی کے صدر اور جملہ اراکین اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ خدائے بزرگ وبرتر مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ اور پس ماندگان کو صبر جمیل ارزانی فرمائے۔ آمین

پروفیسر مرحوم دنیائے ادب میں غیر معمولی شہرت واہمیت کے حامل تھے اور دورِ حاضر کے روشن خیال اور سنجیدہ کارکن تصور کیے جاتے تھے۔ کارکنانِ قضا وقدر نے مرحوم کو ان اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں سے نوازا تھا جو ہر موقع ومحل پر اپنی عظمت وبرتری تسلیم کرا لیتی ہیں۔ ان کے علمی، ادبی اور تعلیمی کارنامے جس طرح زمانہ حال میں دلیل راہ ہیں۔ اسی طرح انشاء اللہ مستقبل میں بھی شمع ہدایت کا کام دیں گے۔

مرحوم کو زبان اردو کے ساتھ والہانہ شیفتگی تھی اور مدت سے انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کے ساتھ خصوصی روابط رکھتے تھے۔ آج انجمن اپنے ایک مخلص مشیر اور سرگرم کرم فرما سے محروم ہو گئی۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی بظاہر ممکن نظر نہیں آتی۔ حق یہ ہے کہ پروفیسر حمید احمد خان کا سانحۂ وفات علمی، ادبی اور تعلیمی دنیا کا سنگین المیہ ہے۔

(۴)

جناب حمید احمد خان کے انتقال پر ملال پر اظہار تعزیت کے لیے ترقی اردو بورڈ کراچی کے ارکان اور عملۂ ادارت کا ایک جلسہ جناب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

"ترقی اردو بورڈ کے ارکان ادارت اور عملے کا یہ جلسہ اردو کے ممتاز ادیب و عالم جناب پروفیسر حمید احمد خان کے ناگہانی انتقال پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم ایک بلند پایہ ادیب، محقق، ماہر تعلیم اور ہردل عزیز استاد تھے۔ وہ ایک سراپا خلوص انسان تھے جن کی شفقت اور انسانیت کا ہر وہ شخص معترف ہوگا جسے ان کی ذات سے کسی عنوان بھی قرب رہا ہو۔ وہ کئی سال تک اس ادارے کے رکن بھی رہے اور اس کی سرگرمیوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے علمی و ادبی کارنامے اردو زبان کا عزیز سرمایہ ہیں اور ان کی یاد ان کے بہت سے دوستوں اور رفقائے کار کے دل میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

حاضرین جلسہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور ان کے پس ماندگان کے شریک غم ہیں۔"

(۵)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے ارکان اور کارکنوں کا یہ جلسہ جناب پروفیسر حمید احمد خان سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سانحۂ ارتحال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

پروفیسر صاحب مرحوم بہت بڑے ماہر تعلیم، محقق اور ادیب تھے۔ تعلیمی اور علمی میدان میں ان کی خدمات عالیہ انتہائی وقیع اور ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے انتقال سے علم و عمل کا ایک بڑا ستون گر گیا۔ اور پاکستان اُن کی گراں مایہ شخصیت کے گوناگوں فیضان سے محروم ہو گیا۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی خدمات جلیلہ کو شرف قبول عطا کر کے انھیں جنت الفردوس میں مقام رفیع ارزانی فرمائے، اور جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔

(۶)

۲۵ مارچ ۱۹۷۴ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کے رفقاء، دارکان کا اجلاس پروفیسر محمد سعید شیخ ڈائرکٹر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کی وفات پر گہرے حزن و ملال کا اظہار کیا گیا اور ان کی مختلف النوع خدمات کی بنا پر ان کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ مرحوم متعدد اوصاف کے حامل اور بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ برصغیر پاک، و ہند کے ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ کامیاب معلم، منجھے ہوئے ادیب اور محتاط مصنف تھے۔ انگریزی، اردو اور فارسی کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے لیکچرر کی حیثیت سے کیا۔ پھر پروفیسر ہوئے۔ چونکہ انتظامی صلاحیتوں سے بھی پوری طرح بہرہ ور تھے، لہٰذا اس کالج کے پرنسپل مقرر کیے گئے۔ بعد ازاں اپنی خدمات گوناگوں کی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کے کئی سال تک وائس چانسلر رہے۔ بعض علمی و تحقیقی نوعیت کے وفود کے سربراہ کی حیثیت سے حکومت اور یونیورسٹی کی طرف سے مختلف بیرونی ممالک میں بھی گئے اور اپنے ملک کی نمایندگی کے فرائض انجام دیے۔ کئی

چھپتے چھپتے

ڈاکٹر ممتاز حسن

اردو زبان کا عاشق

حمید احمد خاں ہمارے زمانے کے چوٹی کے اہلِ علم میں سے تھے۔ نہ صرف یہ کہ ان کا علم ان کے اکثر ہم عصر علما سے زیادہ تھا، بلکہ ان کی طلب علم اُن کے علم سے بھی زیادہ تھی۔

وہ برصغیر ہندوپاک کے ایک سربرآوردہ علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی سراج الدین احمد خاں ایک بلند پایہ ادیب اور مصنف تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا ظفر علی خاں نے علم کی نسبت سیاست اور صحافت میں نام پیدا کیا۔ مگر حمید احمد خاں نے سیاست کی کوچہ گردی نہیں کی۔ ساری عمر علم اور تحقیق اور تعلیم اور تعلم سے وابستہ رہے۔ ابتدائی تعلیم وزیرآباد میں ہوئی۔ جہاں کے مشن اسکول میں گراہم بیلی صاحب اُن کے استاد تھے۔ بی۔ اے انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سے خصوصی امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ انگریزی کا ایم۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے اور انگریزی ادب میں ایم۔ لٹ کیمبرج یونیورسٹی سے۔ پہلے پہل انھوں نے پُرانے اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسری کی۔ بعد میں اسلامیہ کالج سول لائنز میں پرنسپل ہوئے۔ اور اس کالج کو اپنے علمی انہماک اور مثالی کردار سے سارے پاکستان کے لیے ایک قابلِ تقلید ادارہ بنا دیا۔ یہاں سے وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ انھوں نے اس یونیورسٹی کے لئے دن رات کام کیا اور ایک لمحہ بھی فرصت کا اپنے لئے نہ چھوڑا اور صحت بگاڑ لی۔ ہمارے ملک میں جو شخص بھی کام کرے لوگ اس کے دشمن ہوجاتے ہیں۔ حمید احمد خاں نے بہت زیادہ کام کیا اور معمول سے زیادہ دشمنی مول لی۔ نتیجہ یہ کہ وقت سے پہلے یونیورسٹی سے دست بردار ہوئے۔ اس کے بعد وہ ادارۂ ترقی ادب کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ اسی ادارے کے سربراہ تھے۔ جب ۲۲ر مارچ ۱۹۷۴ء کو انتقال ہوگیا۔

حمید احمد خاں پاکستان کے بے لوث اور مخلص خادم، غالبؔ اور اقبالؔ کے بلند پایہ ناقد اور مداح اور اردو زبان کے عاشق تھے۔ پاکستان میں ان سے بڑا غالب شناس پیدا نہیں ہوا۔ نہ ہی کسی نے غالب پر اتنا کام کیا۔ یا دوسروں سے اتنا کام لیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے ان کے زیرِ ہدایت اور زیر نگرانی غالب کی صد سالہ برسی پر کتابوں کا ایک سلسلہ شایع کیا۔ خود انھوں نے اس موقع پر نسخۂ حمیدیہ کی اس محنت اور جانفشانی سے ترتیب اور تصحیح کی کہ اب یہ نسخۂ حمیدیہ حمید احمد خاں ہی کا ہے۔ اقبال سے ذاتی راہ و رسم تھی۔ پاکستان پر جان دیتے تھے۔ اور اردو تو ان کی زندگی تھی۔

حمید احمد خاں کی تصنیفات جو چھپی ہیں وہ مقابلۃً کم ہیں۔ مگر ان کی وہ تحریریں جو ابھی تک چھپی نہیں ہیں۔

(باقی ص ۱۶۷ پر)

توصیف احمد

حمید احمد خاں ہمیں کب اچھّے لگے

معروف ماہر تعلیم اور پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان کا انتقال ہو گیا، یوں تو جو بھی اس دنیا میں آیا اسے ایک نہ ایک دن جانا ہے۔ مگر بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خاں صاحب کا شمار ان ہی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ جنازے میں ہزاروں کا ہجوم تھا۔ کون سی آنکھ تھی جو اشکبار نہ تھی۔ رونے والوں میں ان کے ساتھی، دوست، اور شاگرد بھی شامل تھے۔

خاں صاحب اللہ کو پیارے ہوئے اب تعزیتی جلسے ہو رہے ہیں، مضامین پڑھے جا رہے ہیں جن میں ان کی شخصیت کے پہلو اجاگر کیے جا رہے ہیں۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ خاں صاحب کے بارے میں کیا لکھیں؟ کبھی شاگردی کی سعادت نصیب نہیں ہوئی کہ ان دنوں ہم امتحان دینے اور فیل ہونے کے شغل میں مصروف رہا کرتے تھے، ہڑتالیں کرواتے، جلوس نکالتے دوسرے کالجوں میں تو خیر ہمیں خاصی کامیابی ہوتی، مگر اسلامیہ کالج کے لڑکے ہمارا ساتھ دینے میں ہچکچاتے جب ذرا زور لگاتے تو جواب ملتا، یار کہتے تو ٹھیک ہو۔ مگر خاں صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ جی ہاں پروفیسر حمید احمد خاں ان دنوں پرنسپل ہوا کرتے تھے اور ہمیں وہ بالکل اچھے نہیں لگتے تھے۔

ظاہر ہے جب یہ لچھن ہوں تو پڑھائی خاک ہوتی۔ سو کچھ دن آوارہ گردی کی اور پھر "اخبار نویس" بن گئے۔ خاں صاحب ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے تھے، ایوب خاں کا دور تھا۔ طلبہ ہنگامے کرتے اور ہمیں رپورٹنگ کرنی پڑتی۔ ہمیں ان دنوں بھی خاں صاحب بالکل اچھے نہیں لگتے تھے۔ ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ پولیس یونیورسٹی کیمپس میں گھس کر لڑکوں کو مارتی ہے اور وہ کیوں خاموش رہتے ہیں؟

پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ خاں صاحب نے وائس چانسلری چھوڑ دی۔ بڑا پر آشوب دور تھا۔ نوکر شاہی کا بڑا دبدبہ تھا۔ حالت یہ تھی کہ محکمہ تعلیم کا جوائنٹ سکریٹری وائس چانسلر کو ہدایت دیا کرتا تھا۔ سو کچھ پولیس کی زیادتیاں اور کچھ محکمہ تعلیم کی کارگزاریاں، خاں صاحب زیادہ دن برداشت نہ کر سکے اور خاموشی سے علٰحدہ ہو گئے۔ ہمیں جب یہ معلوم ہوا تو پہلی مرتبہ وہ بڑے اچھے لگے کہ خدا کا شکر ہے ملک میں ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتے۔

جنوری ۱۹۶۶ء میں ہمشیرہ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے گھر میں بڑا فساد برپا کیا اور ہماری شادی طے کرادی ہم گھر کے باہر مہمانوں کے استقبال میں مصروف تھے کہ خاں صاحب معہ اہلیہ تشریف لائے، بڑی جرت ہوئی۔ پیار سے ملے۔ پھر وہ احمد ندیم قاسمی اور احمد علی خاں سے باتوں میں مصروف ہوگئے۔ تصویریں کھنچوائیں اور جب جانے لگے تو بڑی اپنائیت سے ہاتھ ہمارے کندھے پر رکھا اور بولے کہ "توصیف میاں یہ بڑا مقدس رشتہ ہے ہمیشہ اس کا احترام کرنا۔"

خاں صاحب تو یہ کہہ کر چلے گئے مگر ہم کافی دیر تک کھڑے سوچتے رہے، ان کے اس چھوٹے سے جملے میں اتنی محبت شفقت اور خلوص تھا کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ ہم خاں صاحب کو نہیں جانتے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ان کا تعلق اس پرانے مکتب فکر سے تھا جس میں استاد اور شاگرد کے درمیان اپنائیت کا ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو رول نمبر سے نہیں بلکہ نام سے جانتے تھے۔ بعض اوقات اُن کی سخت گیری شاگردوں کے لیے باعثِ تکلیف تھی۔ مگر انھیں ہمیشہ یہ احساس رہتا کہ اس سخت گیر استاد کے پیچھے ایک نہایت مشفق اور رحم دل انسان چھپا ہوا ہے جسے ان کی بہبود کا خیال ہے۔ اور شاید یہی وہ احساس تھا کہ ان کی موت پر ہر شخص سوگوار تھا، جیسے کسی اپنے پیارے سے بچھڑ گئے ہوں۔

تو دوستو پروفیسر حمید احمد خاں کا انتقال ہوگیا، اب جلسے ہو رہے ہیں۔ اس دن پاکستان نیشنل سنٹر میں اسی نوعیت کی محفل تھی، صدارت کے فرائض مرحوم کے شاگرد اور صوبائی وزیر جناب حفیظ کاردار نے انجام دیے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں یہ انکشاف کیا تھا کہ آیندہ تین چار روز کے اندر پروفیسر حمید احمد خاں کو ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا جانے والا تھا۔ مگر ان کی بے وقت موت نے ایسا نہ کرنے دیا۔ ہم نے جناب کاردار کی بات سنی تو کچھ عجیب سا لگا۔ ان کی زندگی میں اُن کے ساتھ کیا کچھ نہ ہوا۔ فیسوں میں کمی کے سلسلے میں انجمن حمایت الاسلام سے اختلاف ہوا تو پرنسپل شپ چھوڑی، پھر بیوروکریسی سے اختلاف ہوا تو وائس چانسلری گئی۔ کاش نئی تقرری کا اعلان ان کی زندگی میں ہو جاتا مگر شاید یہ ہماری "روایات" کے خلاف ہے۔ ہمیں تو انسان کی خوبیاں اس کے مرنے کے بعد ہی معلوم ہوتی ہیں۔ ؎

عمر بھر کرتے رہے سنگ زنی اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

اردو ادب کی زندہ روایتوں کا علمبردار

تخلیق
آپ کو دعوتِ مطالعہ دیتا ہے

مدیر:۔ اظہر جاوید
فی پرچہ:۔ ایک روپیہ

ماہنامہ تخلیق۔ ۲۔ سکلیگن روڈ ۔۔۔ لاہور

پروفیسر حمید احمد خاں

دو خط

صہبا لکھنوی کے نام

(۱)

لاہور۔ ۱۶ر فروری ۱۹۷۳ء

برادر عزیز القدر۔ سلام مسنون!

آپ کی نوازشات وعنایات کی وضع داری کا وہی عالم ہے جو داغ نے کبھی خیال محبوب سے وابستہ کیا تھا ؎

کتنا با وضع ہے خیال اُس کا
بے کسی میں بھی آئے جاتا ہے

اس وقت آپ کا ۲۷ر جون ۱۹۷۲ء کا گرامی نامہ میرے سامنے ہے۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتا ہوں تو وہ افکار و مقالات جن کی توقع آپ نے مجھ سے بوجہ حسن ظن قایم کی ہے۔ دور دور تک مفقود محض معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی محبت آمیز توجہ کے جواب میں میرے پاس نذر کرنے کو اگر کچھ ہے تو صرف اپنی ناکردہ کاری کے لیے احساس ندامت۔

احمد ندیم قاسمی میرے کرم فرما ہیں اور آپ میرے محب گرامی قدر۔ مقام حسرت ہے کہ "افکار" کا "ندیم نمبر" مرتب کرنے کا منصوبہ بنائیں اور میں آپ کا ہاتھ نہ بٹا سکوں[۱] لیکن میں اب بقدر ہمت ہی احباب کے علمی کارناموں میں حصہ لے سکتا ہوں اور ہمت کا حال یہ رہ گیا ہے کہ اپنے لکھے ہوئے متفرقاتِ پارینہ کو سمیٹنے کی توفیق بھی حسب دل خواہ نصیب نہیں ہو رہی۔

میں ہمیشہ سے کوتاہ قلم آدمی تھا مگر اب جو صورت حال ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ اس خط کے ساتھ ایک برگ سبز (صادقین کی نمایش پر مختصر سا مضمون جو افکار کے شمارہ اپریل ۱۹۷۳ء میں چھپا ہے) ملفوف کر رہا ہوں جو شاید کسی عام شمارے کے لیے آپ کو اور ناظرین "افکار" کو اس درویش کے سلام محبت کے ساتھ قبول ہو۔

خاکسار حمید احمد خاں

---

[۱] اس گرامی نامہ کے بعد میں نے پھر پیغام کے لیے اصرار کیا تو آپ نے ازرہ شفقت "ندیم نمبر" کے لیے پیغام سے نوازدیا جو "ندیم نمبر" میں شامل ہے۔ (ص)

(۲)

مجلس ترقی ادب ــ لاہور
۳ر دسمبر ۱۹۷۳ء

برادرم　　السلام علیکم !

ادبی رسائل کی موتمر سالانہ کے سلسلے میں گرامی نامہ مورخہ ۱۶ر نومبر موصول ہوا، میں اس مؤتمر کے انعقاد کا خیر مقدم کرتا ہوں اور آپ کو اپنی دلی مبارک باد بھیجتا ہوں کہ آپ نے ایک اہم قومی ضرورت کا احساس کرکے اہلِ علم و ادب اور اربابِ حل وعقد کو اس پر متوجہ کرنے کی صورت نکالی ۔

پاکستان کی ذہنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جو پاسبان دن رات چوکس کھڑے ہیں اُن میں ہمارے گراں قدر ادبی رسائل بھی ہیں ۔ ہمیں داخلی تحفظ کے معاملے میں اُسی طرح دن رات بیدار رہنا ہے جس طرح ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کے لیے ہمارے عساکر صف بستہ کھڑے ہیں ۔ میں دعا کرتا ہوں کہ جن قومی، "گو نظر نہ آنے والی" سرحدوں کی حفاظت آپ کے سپرد ہے، اُن میں کہیں کوئی رخنہ پیدا نہ ہو اور آپ کی مساعیٔ جمیلہ بیش از بیش کامیاب ہوں ۔

خاکسار
حمید احمد خاں

(بقیہ اردو زبان کا عاشق صفحہ ۱۶۳ سے آگے)

شایع شدہ تحریروں سے زیادہ ہیں ۔ اور ان کی اصل "تصنیفات تو ان کے شاگرد ہیں" اور وہ دوست آشنا اور مداحین جنھوں نے اُن کی علمی، تحقیقی اور ثقافتی سرگرمیوں سے الہام لیا ۔ اور ان کی زندگی اور کارنامے سے متاثر ہوئے ۔

حمید احمد خاں کو حکومت پاکستان نے ستارۂ امتیاز اور ستارۂ پاکستان کے اعزازات دیے ۔ انھوں نے بین الاقوامی کانفرنسوں میں ملک کے ایک آدھ وفد کی قیادت بھی کی ۔ مگر کیا ان کے عہدے اور کیا ان کے اعزازات ۔ یہ اُن کے لیے باعث عزت نہیں تھے ۔ بلکہ ان عہدوں اور ان اعزازات کو ان کی ذات سے عزت اور اہمیت حاصل ہوئی ۔

حمید احمد خاں انسانیت کے مجسمے اور اخلاص کے پتلے تھے ۔ ان کا جسد خاکی سپرد خاک ہو گیا، مگر وہ نہیں مرے اتنا بڑا انسان موت سے مغلوب نہیں ہو سکتا ۔ وہ زندہ ہیں اور ان کے کارنامے، ان کی سیرت، اُن کی انسانیت سب زندہ ہیں :۔

فتیً عِیشَ فِی مَعْرُوفِہٖ بَعدَ موتِہٖ
کَمَا کَانَ بَعدَ السَّیلِ مَجراہُ مُرتَعَا

اچھا ادب — معیاری لائبریری

ان کتابوں کے بغیر نامکمل ہے

اسلامیات

سیرت رسول اللہؐ — پروفیسر نواب علی — ۱۸/-

تاریخ صحف سماوی — 〃 — ۸/-

معارج الدین — 〃 — ۷/-

شخصیت، فن، ادب، سفر نامہ

اقبال اور بھوپال — صہبا لکھنوی — ۱۵/-

مشرقی پاکستان — 〃 — ۶/-

مجاز ایک آہنگ (مرتب) — 〃 — ۲/-

جوبلی نمبر — 〃 — ۳/-

جوش نمبر — 〃 — ۲۵/-

حفیظ نمبر — 〃 — ۲۵

فیض نمبر — 〃 — ۲۵/-

مصطفےٰ زیدی ایڈیشن — 〃 — ۸/-

حفیظ ہوشیارپوری ایڈیشن — 〃 — ۵/-

سجاد ظہیر ایڈیشن — 〃 — ۶/-

شاعری

غزل معلیٰ — سید آلِ رضا — ۸/-

نبضِ دوراں — پروفیسر شور علیگ — ۸/-

ناول و افسانہ

حیدری کی مختصر کہانیاں — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ۸/-

چاندی کا گھاؤ — کرشن چندر — ۱۲/-

ایک وائلن سمندر کے کنارے — 〃 — ۸/-

ٹرک واپس جاتی ہے — 〃 — ۹/-

ایک عورت ہزار دیوانے — 〃 — ۸/-

ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی — 〃 — ۷/-

دھواں دھواں سویرا — انور عظیم — ۱۰/-

تنہا اُداس لڑکی — سیدہ حنا — ۳/-

اک بوند لہو کی — جوگندر پال — ۶/-

تنقید و تحقیق

تنقیدی تجربے — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ۱۳/-

جدید شاعری — 〃 — ۱۸/-

شاعری اور شاعری کی تنقید — 〃 — ۶/-

مادھونل کام کندلا — 〃 — ۵/-

ہفت گلشن — 〃 — ۵/-

تہذیب و تحریر — پروفیسر مجتبیٰ حسین — ۷/-

زیر ترتیب

غالب ایک صدی (مرتب) صہبا لکھنوی

انفرادی خریداروں اور لائبریریوں کے لیے خاص رعایت
کتابوں کی تمام سابقہ قیمتیں کالعدم تصور کی جائیں۔

مکتبۂ افکار

رابسن روڈ کراچی — فون ۷۳۹۹۳

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی • طابع ایجوکیشنل پریس کراچی • دفتر رابسن روڈ کراچی • کتابت: انوری بیگم دہلوی

فائر
ایکسیڈنٹ
میرین

اور دیگر متفرق
بیمہ کاری کے لئے

TOTAL SECURITY

مکمل
تحفظ

دی اسٹینڈرڈ انشورنس کمپنی لمیٹڈ